قیمت: عہ/ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا ابو الکلام آزاد اپنی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور وسیع علم کی بنا پر تقلید جامد کو ناپسند اور بعض مسائل میں آزادانہ رائے رکھتے تھے، اس لیے عام مسلمانوں کو ان کی تحریروں میں کہیں کہیں بے اعتدالی نظر آتی ہے جس سے ان کے بارہ میں طرح طرح کی غلط فہمیاں اور یہاں تک خیال ہو گیا تھا کہ وہ نجات و سعادت کے لیے ایمان بالرسالت کو ضروری نہیں سمجھتے اور بظاہر ترجمان القرآن جلد اول وغیرہ کے بعض مباحث سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے، اس لیے مولانا کے احباب اور عقیدت مندوں نے اس بارہ میں ان سے استفسار کیا، اور مولانا نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا، زیر تبصرہ پمفلٹ میں قاضی احمد حسین صاحب نے مولانا کے ان ہی مکتوبات کو شائع کیا ہے، جس سے ان کے عقیدہ و مسلک کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، مولانا غلام رسول مہر اور حکیم سعد اللہ کے نام خطوط کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے، اس پمفلٹ کی اشاعت بہت ضروری تھی۔

امثال آصف الحکیم

از مولانا حمید الدین فراہیؒ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۹ قیمت عہ/ پتہ: دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے علوم عربیہ کی تحصیل کے زمانہ میں حکیم آصف کی تمثیلی حکایات کا انگریزی سے عربی ترجمہ کیا تھا، جو عرصہ ہوا کتابی شکل میں شائع ہوا تھا، مگر اب خوبصورت ٹائپ میں خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، یہ حکایات حکیمانہ بھی ہیں اور دلچسپ بھی، اسلیے یہ رسالہ اپنی سبق آموزی کے لحاظ سے عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کے نصاب میں شامل کرنے کے لائق ہے،

"ض"

جلد ۸۴۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۹ء نمبر ۴

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری قدیم تہذیب کی یادگاریں ایک ایک کرکے اٹھتی جاتی ہیں اور پرانی محفل اجڑتی جاتی ہے، ان ہی یادگاروں میں ایک چودھری محمد علی صاحب مرحوم ردولوی بھی تھے، وہ امراء و شرفائے اودھ کی تہذیب کا نمونہ تھے۔ ان کی شخصیت بڑی دلکش و دلپذیر تھی، بڑے خوش مذاق، زندہ دل، بذلہ سنج حاضر جواب اور علم مجلسی کے بڑے ماہر تھے، انکی ہر چیز میں خوبی و لطافت اور زبان و قلم دونوں میں بڑی دلکشی تھی، تحریر میں صاحب طرز ادیب اور خوش گفتاری میں ہزار داستان تھے جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی خوش بیانی سے چھا جاتے تھے۔ ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ بڑی تازگی اور بے ساختگی تھی، اس طرز میں وہ منفرد تھے، اہل زبان حضرات میں بھی اس طرز میں لکھنے والا کوئی نہ تھا، مگر ان کی تحریر اور گفتگو دونوں میں اودھ کا پرانا بے فکری کا تفریحی مذاق غالب تھا اس لئے تحریر کا دائرہ ادب و افسانے تک محدود تھا، اور اسی میں ان کا طرز تحریر کھلتا بھی تھا، سنجیدہ علمی و ادبی مباحث سے ان کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، اگر کبھی بھولے سے اس کوچہ میں نکل آتے تھے تو اس میں بھی تفریحی رنگ پیدا ہو جاتا تھا یہی حال انکی گفتگو کا تھا، انکی سنجیدہ گفتگو بھی لطائف و ظرائف سے خالی نہ ہوتی تھی،

انکی عمر اسّی کے قریب تھی مگر انکی طبیعت صدا بہار تھی، اسلیے اس زمانہ میں بھی نہ وہ کسی سوسائٹی کے لیے اجنبی ہوئے تھے اور نہ کوئی سوسائٹی ان کے لیے اجنبی تھی، ہر عمر اور ہر مذاق اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اور جس مجمع میں بیٹھتے تھے اس میں گھل مل کر اس طرح اس کے مذاق کی باتیں کرتے تھے کہ اسی کی ایک فرد معلوم ہوتے تھے، انکی صحبت زعفران زار ہوتی تھی جس سے ہر مذاق کا آدمی لطف اندوز ہوتا تھا، وہ آج سے نصف صدی

پیشتر کے لکھنے والے تھے، لیکن ان کی تحریر کی تازگی میں اب بھی فرق نہیں آیا تھا، ان کا مطالعہ وسیع تھا، اسلامیات پر بھی انکی نظر تھی، اور آجکل کے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ معلومات رکھتے تھے اور کسی موضوع پر بھی بند نہ تھے، انگریزی و اردو کا ایک مختصر کتب خانہ بھی ان کے پاس تھا جس میں انگریزی کی بعض اچھی کتابیں تھیں، ان کے ورثہ میں ان کے بعد ان کا کوئی قدردان نہیں ہے، خدا معلوم اس کا انجام کیا ہو،

وہ مذہبًا شیعہ تھے، مگر بڑے معتدل اور شیعہ سنی اتحاد کے بڑے علمبردار تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے "میرا مذہب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، عرصہ سے محرم کی بدعتوں کو ترک کر دیا تھا، ایک زمانہ میں بڑے آزاد خیال، وسیع المشرب اور رنگین مزاج تھے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان بڑھتا گیا تھا اور ادھر چند برسوں سے بڑے مذہبی ہو گئے تھے، اور ان کے دل میں بڑا سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا، حضرت امام زین العابدین رض کی دعاؤں کا ایک مجموعہ انکے ورد میں رہتا تھا اور اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کرکے اکثر رویا کرتے تھے اور آنے جانے والوں سے اپنی دعائے مغفرت کی درخواست کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے پوری توقع ہے کہ وہ انکی مغفرت فرمائیگا، جس طرح انکی زندگی میں شیعہ و سنیوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اسی طرح انکی وفات کے بعد بھی انکی وصیت کے مطابق دونوں نے الگ الگ ان کی نماز جنازہ پڑھائی، چودھری صاحب جس تہذیب کی یادگار تھے، اب وہ تہذیب مٹ چکی ہے، اس لیے ان کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا اور اب ایسے نمونے پیدا نہ ہوں گے،

یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ — سن رکھو تم، فسانہ تھے یہ لوگ

انگریزوں پر یہ الزام بالکل بجا تھا کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ عمداً غلط رنگ میں پیش کی، اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ ایک حد تک قابل معافی تھے کہ حکومت کے قیام و بقا کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ میں اسی پرانی روش پر قائم رہنا اور تاریخ

میں ایسی باتیں لکھنا جس سے مسلمانوں یا کسی فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہو، کہاں تک مناسب اور ہندوستان کے مفاد کے موافق ہے، افسوس ہے کہ بڑے بڑے ہندو مورخین کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے اور مسلمانوں کے متعلق ان کے قلم پر جو بھی آتا ہے لکھ جاتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا۔

بھارتیہ ودیا بھون بمبئی کی جانب سے بڑے اہتمام سے ہندوستان کی ایک مبسوط تاریخ "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل" کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہے، اسکی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، ہندوستان کے مشہور مورخ آر۔ سی موجمدار اس کے جنرل اڈیٹر اور کے۔ ایم منشی سابق گورنر یوپی اسکے دیباچہ نگار ہیں، ان دونوں نے پانچویں جلد میں مسلمانوں کے متعلق نہایت دل آزار باتیں لکھی ہیں، منشی جی سے تو اسکی شکایت نہیں کہ مسلم آزاری ان کا مستقل شیوہ ہے جس سے وہ کبھی نہیں چوکتے، مگر موجمدار جیسے ذمہ دار اور نامور مورخ سے اس کی توقع نہ تھی، جب ان کا یہ حال ہے تو معمولی درجہ کے مورخین کا کیا ذکر۔

انگریزوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کے مفاد کا تقاضا تھا، مگر آزاد ہندوستان کا مقصد تو ہندو مسلمانوں کو ملانا اور متحدہ قومیت کی تعمیر ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ یہی ہے اور اسی سے دونوں فرقوں میں وحدت پیدا ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ہم آزاد تو ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہم میں آزاد قوموں کی بلند نظری اور وسعت قلب نہیں پیدا ہوئی ہے اور ہمارا قدم تنگ نظری کے پرانے دائرے سے باہر نہیں نکلا ہے، اور آج بھی ہندوستان میں ایک بڑی جماعت ایسی موجود ہے جو مسلمانوں کو غیر قوم سمجھتی ہے، اور اس کو ہندوستان میں ان کا وجود گوارا نہیں اور وہ انکے دور حکومت کو ہندوستان کی تاریخ سے مٹا دینا چاہتی ہے جس کا ثبوت زندگی کے ہر شعبہ میں برابر مل رہا ہے، یہ کتاب بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ اس پر کسی آیندہ پرچہ میں مفصل تبصرہ آئے گا۔

گذشتہ ۱۰ اکتوبر کو دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا تھا، بیرونی ارکان اور عہدہ داروں میں ڈاکٹر سید محمود صاحب، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، اور مولانا عمران خان صاحب نے شرکت فرمائی، اور دار المصنفین کے مسائل پر غور کیا اور مفید مشورے دیے، دو دن دار المصنفین میں بڑی چہل پہل رہی۔

مقالات

فقہ اسلامی کے ماخذ

(۲)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر

ماقبل کی شریعت

ماقبل کی شریعت بحیثیت ماخذ

فقہ اسلامی کا آٹھواں ماخذ ماقبل کی شریعت ہے، اس سے مراد منزل من اللہ ہدایت کے تمام وہ راستے اور طریقے ہیں جو دوسری امتوں کے پاس موجود و محفوظ تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں وہی باتیں داخل ہوں گی جو الٰہی پالیسی اور اس کے بنیادی اصول کے موافق تھیں اور جن میں انسانی اغراض نے تصرفات کر دیے تھے یا وہ حالات و زمانہ کے تقاضے کے مناسب رہ گئی تھیں، ان کے قبول کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ ماخذ بن سکتی ہیں، اصل یہ ہے کہ بنیادی تعلیمات میں تمام شریعتوں کے باوجود قومی مزاج اور حالات و تقاضا کی مناسبت سے ان کے راستے اور طریقوں میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس لیے ہر بعد میں آنے والی شریعت اپنے ماسبق کی ان ہی باتوں کے اپنانے پر مامور ہوتی تھی، جو بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دیکر الٰہی پالیسی (منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ) کی بقا میں مددگار ثابت ہوتی تھیں اس کے متعلق حسب ذیل آیات ہیں:

قرآن حکیم سے اس کا ثبوت

انبیاء اور ان کی شریعتوں کے تذکرہ کے بعد رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے،

اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (الانعام)

یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھیں اللہ نے ہدایت کی ہو ان کے ہدیٰ کی آپ اتباع کیجیے۔

ہدیٰ کی تشریح فقہا نے یہ کی ہے:

والھدی اسم للایمان والشرائع جمیعا لان الاھتداء یقع بالکل فیجب علیہ اتباع شرعھم[1]

ہدیٰ ایمان (بنیادی اصول) اور شرائع (راستہ اور طریقہ) سب کو شامل ہو کیونکہ ہدایت پانے کا تعلق سب سے ہے اسلیے ان (انبیاء) کی شریعت کا

دوسری آیت میں ہے:-

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسی وعیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوری)

اللہ نے تمھارے لیے وہی الدین مقرر کیا ہو جسکی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ الدین کو قائم رکھو اور اس میں الگ الگ نہ ہو،

ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم اس آیت میں ہے:

ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا (النحل)

ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیمی کی اتباع اور پیروی کیجیے

رسول اللہ کے طرز عمل سے شہادت

اسی طرح قصاص حدود وغیرہ سے متعلق ماقبل کی شریعتوں کے بہت سے جزوی احکام قرآن حکیم میں موجود ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے بھی ثبوت ملتا ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے کہ "اگر کسی بات کے متعلق براہ راست وحی نہ آئی تو آپ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے طور طریقوں پر عمل کرنا پسند فرماتے تھے"

لہ کتاب التحقیق ص ۲۰۱

مسند امام احمد بن حنبل میں ایک روایت ہے جس میں اہل کتاب کی خصوصیت نہیں ہو بلکہ زمانہ جاہلیت کی اچھی باتوں پر بھی عمل کا ثبوت ملتا ہے۔

یعمل فی الاسلام بفضائل الجاھلیۃ[1]

اسلام میں زمانۂ جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

اسی بنا پر محدثین نے فرمایا ہے:

وان شرع من قبلنا یلزمنا مالم ینقض اللہ بالانکار[2]

پہلی شریعتوں پر عمل کرنا ضروری ہو جبتک وحی الٰہی کی طرف سے اس پر نکیر نہ کیجائے۔

اخذ و استفادہ حالات و زمانہ کے تقاضے پر محدود تھا

یہ اخذ و استفادہ کن باتوں اور طریقوں میں تھا، اس کی تصریح درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے

فان مصالح العباد قد یتفق وقد تختلف فیجوز ان یکون الشیٔ مصلحۃ فی زمان النبی الاول دون الثانی ویجوز عکسہ ویجوز ان یکون مصلحۃ فی زمان الاول والثانی ویجوز ان یختلف الشرائع ویتفق[3]

بندوں کی مصلحتوں میں اگلے اور پچھلے زمانہ میں کبھی اتفاق ہوتا ہے اور کبھی اختلاف ہوتا ہے، ممکن ہے کہ پہلے نبی کے زمانہ میں کوئی مصلحت ہو جو دوسرے کے زمانہ میں بدل گئی ہو اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مصلحت نہ بدلی ہو لیکن اس کے حاصل کرنے کے راستے اور طریقے بدل گئے ہوں۔

اس بنا پر یہ استفادہ حالات و زمانہ کے تقاضے کی مناسبت پر موقوف ہوگا،

چونکہ ماقبل کی شریعتوں سے استفادہ رسول اللہ کے زمانہ میں ہوا تھا اور آپ نے اس کی

لہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ از امام ابو حنیفہ کی تدوین ص ۲۶ ۲ عینی ۳ کتاب التحقیق ص ۲۰۱

قانونی حیثیت تسلیم فرمائی تھی، اس لیے اس کی حیثیت "سنت" کی قرار پائے گی اور یہ ماخذ سنت ہی میں داخل سمجھا جائے گا، رہا یہ امر کہ تدوین فقہ کے زمانہ میں فقہاء نے یہود و نصاریٰ وغیرہ کے فقہ سے باقاعدہ استفادہ کیا ہو تو اس کا ثبوت ابتک فراہم نہیں ہو سکا ہے۔

کیا اسلامی فقہ دوسرے قوانین سے ماخوذ ہے

البتہ بعض مماثلتیں اس قسم کی ضرور ہیں جن سے شبہہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے فقہاء نے الٰہی پالیسی اور بنیادی اصول کے ماتحت کہیں کہیں جزوی استفادہ کیا ہو لیکن اس قسم کی خفیف مماثلت یقین کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عموماً تین مذاہب کے فقہ سے اثر پذیری کا ذکر زیر بحث لایا جا سکتا ہے:

(۱) پارسی مذہب

(۲) عیسائی مذہب

(۳) یہودی مذہب

۱- پارسی فقہ اور اسلامی فقہ میں مماثلت و مشابہت ابتک نہیں ثابت ہو سکی ہے۔ دو چار باتوں کا دونوں میں اشتراک (مثلاً نماز، مسواک وغیرہ) اثر و تاثیر کی دلیل نہیں بن سکتا ہے، بلکہ محققین کی رائے ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین کے زمانہ میں پارسیوں کے مذہبی قوانین کا نظم و ترتیب کے ساتھ وجود ہی نہ تھا۔

(۲) عیسائی مذہب میں دین و دنیا کی تفریق سے اس کی اور اسلام کی مغایرت ظاہر ہے۔ مذہبی احکام و قوانین نہایت تھوڑے اور محدود ہیں جو زندگی کے تمام گوشوں کیا معمولی حصوں پر بھی حاوی نہیں ہیں، اور وہ بھی بڑی حد تک یورپ کے وقتاً فوقتاً صادر کردہ احکام پر مبنی ہیں، بلکہ کلیئ قانون کو خود اسلامی فقہ نے ملک شام وغیرہ میں متاثر کیا ہے۔ قانون جبر و اکراہ وغیرہ (جن کے بارے میں بعض کا خیال ہے) میں کسی درجہ کی مماثلت فقہ کی اثر پذیری کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے۔

(۳) البتہ یہودی مذہب کے احکام سے فقہ کی مماثلت ضرور بیان کی جاتی ہے، چنانچہ تالمود (یہودی فقہ) میں عیسائی مذہب کی طرح عبادات اور قانون میں تفریق نہیں ہے بلکہ مذہبی قوانین دونوں کو شامل ہیں اور وحی الٰہی ان کا ماخذ ہے، اسلامی فقہ کی طرح موشگافی کا رجحان بھی اس میں پایا جاتا ہے، مسائل کے استنباط میں اجتہاد کو دخیل مانا جاتا ہے، ان کے علاوہ بعض اور تشریحات میں بھی مشابہت بیان کی جاتی ہے، مثلاً تالمود[1] کے چند احکام جو فقہ سے مناسبت رکھتے ہیں، یہ ہیں:

(۱) اگر کوئی شخص راستہ چلتے روٹی وغیرہ غذا کے ٹکڑوں پر سے گذرے تو انھیں ایک طرف ہٹا دے اور روندنے سے بچائے (ج ۲ ص ۱۶۰)

(۲) یوم کفارہ کا روزہ رکھنے پر بچوں کو مجبور نہ کیا جائے، بلکہ مقررہ عمر سے دو ایک سال قبل سے اس کا عادی بنایا جائے (ج ۵ ص ۲۵۰)

(۳) تالمود کے مختلف مقامات میں نیم آزاد اور نیم غلام کا ذکر ملتا ہے۔

(۴) تالمود (ج ۹ ص ۴۵) میں طلاق بالمعاوضہ کا ذکر ہے

(۵) لقطہ (پڑی ہوئی چیز) کے متعلق احکام ج ۱۰ ص ۸۵ میں ہیں

(۶) قاضی اور گواہ بننے کی صلاحیت ان لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے جو سود پر قرض دیتے ہیں۔

---

[1] تالمود سے مراد مشنا اور اس کی شرح گمارہ کا مجموعہ ہے، توریت یا حضرت موسیٰ کی تعلیم کا وہ روایاتی مفہوم جو دوسری صدی کے آخر میں یہودیوں میں پایا جاتا تھا، اسکے مجموعہ کو مشنا کہتے ہیں، اسکے چھ باب ہیں (۱) سرائیم۔ نماز و عبادت اور زراعت و مالگذاری (زکوٰۃ) (۲) معید یوم سبت (ہفتہ کا دن) ایام عید روزہ کے احکام (۳) نشیم قانون ازدواج (۴) نیکین قانون دیوانی و فوجداری (۵) قدسیم قربانی اور کھانے پینے کے احکام (۶) طہورات پاکی و ناپاکی کے احکام اس تالیف کے دو ایڈیشن ہیں (۱) تالمود یروشلم تقریباً چوتھی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے (۲) تالمود بابل جو اس سے زیادہ ضخیم ہے اور پانچویں و چھٹی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے۔

زد کھیلتے ہیں اور شرط کر کے کبوتروں کو اڑاتے ہیں (ج ا ص ۲۵۵)

(۷) عورت کے حقوق اور نفقہ کی تفصیل ج ۸ ص ۸۰ میں ہے۔

تمام الہامی مذاہب اور شرائع میں جزوی مماثلت ضروری ہے

لیکن اس قسم کی مشابہت اخذ و استفادہ کا ثبوت بلکہ ان کا ان تمام مذاہب میں پایا جانا ضروری ہے، جو ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور جن کا سرچشمہ ایک ہے، یہودیت بھی ملت ابراہیمی کی شاخ ہے اور اسلام بھی، اس لیے ان دونوں میں اس قسم کی جزوی مماثلت کا ہونا ضروری ہے، اس میں اخذ و استفادہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

رہیں وہ روایتیں جن سے ماقبل کی شریعتوں سے اخذ و استفادہ کی مماثلت ثابت کی جاتی ہے۔

مثلاً یہ واقعہ کہ حضرت عمرؓ نے یہود کی کچھ باتیں نقل کرنی چاہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امتہوکون انتم کما تھوکت الیہود	کیا تم متحیر ہو (اپنے دین اور کتاب کے بارہ میں)
والنصاریٰ لقد جئتکم بھا	جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے متحیر ہو کر دوسری طرف
بیضاء نقیۃ ولو کان موسیٰ	رخ کر لیا ہے، میں تمہارے پاس صاف اور واضح
حیاما وسعہ الا اتباعی[1]	شریعت لے کر آیا ہوں (جو ہر قسم کے شکوک و شبہات
	اور نقص سے خالی ہے) اگر موسیٰ علیہ السلام (صاحب شریعت)
	زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اس کا جواب حدیث کے الفاظ ہی میں موجود ہے، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اثر پذیری اور تاثیر کی مرعوبانہ ذہنیت پر پابندی لگانا چاہتے تھے، جو حدود و قیود کی رعایت کیے بغیر حق و ناحق ہر بات میں اخذ و استفادہ کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے، جیسے آجکل یورپ کی اندھی تقلید کیجاتی ہے، حضرت عمرؓ کا یہود کی باتوں کے بارے میں "تعجبنا" (وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں) کہنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے جواب میں لقد جئتکم بھا بیضاء نقیۃ ارشاد فرمانا

[1] شعب الایمان از مشکوٰۃ ص ۲۸

خود اس کا ثبوت ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ جیسے غیور اور جلیل القدر انسان کو جو یہود کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے، گران کی بعض باتیں ان کو پسند آ گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا ورنہ پھر ان کی تقلید کا دروازہ کھل جاتا، جس کا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔

یا یہ روایت کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس توریت کا نسخہ لائے اور اس کو پڑھنا شروع کر دیا، وہ پڑھتے جاتے تھے اور رسول اللہ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوتا جاتا تھا، جب حضرت عمرؓ کی نگاہ رسول اللہؐ کے چہرہ پر پڑی تو فرمایا

اعوذ باللہ من غضب اللہ	میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، اللہ اور اس کے
وغضب رسولہ رضینا باللہ	رسول کے غضب سے، ہم اللہ کے رب ہونے پر
ربا وبالاسلام دینا	اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وبمحمد نبیا	کے نبی ہونے پر راضی اور خوش ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

والذی نفس محمد بیدہ لو بدأ	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے
لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی	اگر موسیٰ علیہ السلام نمودار ہوتے اور تم مجھے چھوڑ کر
لضللتم عن سواء السبیل ولو کان	ان کی اتباع کرتے تو بھی سیدھے راستے سے
حیا وادرک نبوتی لاتبعنی[1]	گمراہ ہو جاتے اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میری
	نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

اس روایت سے بظاہر اخذ و استفادہ کی عمومی ممانعت معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کی نظر دوسری احادیث پر بھی ہے وہ اس کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد حالات و تقاضا کے بدلنے سے احکام سے جو تبدیلی ہوتی ہے اس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے نہ کہ اخذ و استفادہ سے ممانعت۔

[1] دارمی از مشکوٰۃ ص ۲۹

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حالات ومزاج کا جو فرق تھا، اسکی بناپر شریعت محمدیہ ہی واجب العمل تھی، اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا،

تعامل

فقہ اسلامی کا نواں ماخذ تعامل ہے

صحابہ کا عمل حجت ہے

اس سے مراد رسول اللہؐ کے "اصحاب" کا عمل درآمد ہے، فقہا نے تدوین قانون کے مرحلہ میں اس سے بہت استفادہ کیا ہے، اور اس کو "سنت" میں شمار کرکے بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔

دراصل یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے براہ راست تعلیم وتربیت حاصل کی تھی، آپ کی فکری وعملی زندگی کو اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا تھا، جو کچھ جس طرح آپ سے سنا یا آپ کو کرتے دیکھا، بعینہ اسی طرح اس پر عمل پیرا ہوئے، اگر کہیں اشتباہ ہوگیا تو رسول اللہؐ سے پوچھ کر تشفی کرلی، ان میں کچھ اصحاب ایسے بھی تھے جو قانونی معاملات میں خصوصیت سے ممتاز تھے، اور انکے بارے میں رسول اللہؐ کی زبان مبارک کی شہادت بھی موجود ہے،

ایسی حالت میں ان سے بڑھکر مزاج شناس نبوت اور کون ہوسکتا ہے۔ ان کی رائے اور عمل کے مقابلہ میں کسی کی رائے اور عمل کو اہمیت نہیں دیجا سکتی اور مجموعی حیثیت سے ان کے قول اور فعل کو معیار تسلیم کرنے میں کسی اصول کلی پر زد نہیں پڑتی بلکہ یہ تو عین مقصد نبوت کے مطابق ہے، کیونکہ نبوت اس پر بھی مامور ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کردے جو اس کے بعد ہر حیثیت سے اس کی تعلیمات کی محافظ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے، یہ ظاہر ہے کہ نبی جملہ انسانی ضروریات اور آیندہ پیش آنے والے واقعات کی تعلیم نہیں دے سکتا، البتہ اس کے ارشادات میں ایسے اصول کلیہ ہوتے ہیں جن سے نئے مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے، نبی کی تیار کردہ جماعت چونکہ مزاج شناس نبوت ہوتی ہے، اس لیے وہی اس فرض کو انجام دے سکتی ہے، اس لیے فقہاء

تعامل صحابہ کو حجت تسلیم کیا ہے،

آیات واحادیث سے اس کا ثبوت

درج ذیل آیت سے صحابہؓ کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے،

والسابقون الاولون من المهاجرین	مہاجرین وانصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے
والانصار والذین اتبعوهم	سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے
باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه	راست بازی کے ساتھ ان کی اتباع کی ان سے اللہ
(۹/۱۰۰)	راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس آیت میں "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا جملہ صحابہ کے تعامل کو ماخذ قرار دینے کے بارے میں نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، بالخصوص "ورضوا عنہ" جو الٰہی پالیسی کے ساتھ ان کے تعامل کی ہم آہنگی پر دلالت کرتا ہے،

ان احادیث سے بھی "تعامل" کے ماخذ ہونے پر روشنی پڑتی ہے،

ما من نبی بعثه الله فی امة قبلی	جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے بھیجا
الا کان له فی امته حواریون	سب کی امت میں اس کے مددگار اور اصحاب
واصحاب یاخذون بسنته و	تھے جو نبی کی سنت کو حاصل کرتے اور اس کے
یقتدون بامره[1]	حکم کی اقتدا کرتے تھے۔

دوسری حدیث میں ہے:

فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء	تم لوگ میری سنت اور خلفاء راشدین کی
الراشدین المهدیین تمسکوا	سنت کو لازم پکڑو مضبوطی کے ساتھ اس پر
بها وعضوا علیها بالنواجذ[2]	جمے رہو اور اس سے رہبری حاصل کرو،

---

[1] مسلم از مشکوٰۃ ص ۳۰، [2] ابوداؤد وترمذی

ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سند اور معیار صحابہ کا تعامل پیش کیا ہے:

ما انا علیہ واصحابی[1] — جس راستہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں وہی حق ہے

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا

اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم[2]

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کی نیکی، علم کی گہرائی، بےتکلفی کی کمی میں اس امت کے افضل ترین لوگوں میں ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کی صحبت اور اپنے دین کے قائم کرنے کیلئے منتخب فرمایا ہے، تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہانتک بس چلے مضبوطی کے ساتھ پکڑ وہی لوگ ہدایت مستقیم پر ہیں،

صحابہ کی زندگی پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس ہمہ گیر اور عمیق تبصرہ کے بعد اور کسی شہادت کی ضرورت نہیں باقی رہتی ہے ابرھا قلوبا اعمقھا علما اقلھا تکلفا (زندگی میں سادگی، دل کی پاکیزگی، علم میں گہرائی) یہ وہ اوصاف ہیں کہ جن سے قوموں کی تاریخ بنتی ہے،

تعامل کے بارے میں فقہا کا مسلک

تعامل کے بارے میں فقہا کا یہ مسلک، اصول فقہ میں مذکور ہے،

یجب اجماعا فیما شاع فسکتوا — جو بات تمام صحابہ میں عام طور شائع ہو اور جس کو

---

۱ ترمذی ۲ رزین از مشکوٰۃ ص ۲۹

مسلمین ولا یجب اجماعا فیما ثبت الخلاف بینھم[1] — انھوں نے مان لیا ہو اسکی اتباع واجب ہے اور جس میں کچھ اختلاف ہو اس میں واجب نہیں ہے

اس لیے کہ صحابہ میں جو بات عمومی حیثیت سے پائی جائے گی اس کی حیثیت اجماع کی ہوگی، اور جب اجماع ہر دور کا حجت ہوتا ہے تو صحابہ کا اجماع بدرجۂ اولیٰ حجت ہوگا،

فقہا نے شیخین (حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ) کے کسی بات میں متفق ہونے کو بھی اصولی حیثیت دی ہے اور اس کا اتباع ضروری قرار دیا ہے،

کل ما ثبت فیہ اتفاق الشیخین یجب الاقتداء بہ[2] — ہر وہ بات جس میں شیخین کا اتفاق ثابت ہو اسکی اقتداء واجب ہے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدوین قانون میں اشخاص کے انتخاب میں کمیت کے مقابلہ میں کیفیت کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے، یعنی اشخاص کو تولا جاتا ہے، گنا نہیں جاتا ہے،

مسلمہ شخصیتوں کی رائیں

فقہ اسلامی دسواں ماخذ "مسلمہ شخصیتوں کی رائیں" ہیں۔

اس میں اقوال، فتاویٰ، ثالثی، عدالتی فیصلہ، سرکاری وغیر سرکاری ہدایتیں وغیرہ سب داخل ہیں، مگر مرکزی حیثیت صحابہ کی رایوں کو حاصل ہوگی، رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم[3] — میرے صحابی مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے ہدایت مل جائے گی۔

فقہا نے صحابۂ کرام سے اخذ واستنباط کے یہ دلائل بیان کیے ہیں۔

صحابہ کی رایوں کے مستند ہونے کے دلائل

لان اکثر اقوالھم مسموع حضرۃ — ان کے اکثر اقوال زبان رسالت سے سنے ہوئے ہیں اور اگر انھوں نے اجتہاد بھی

---

۱ توضیح وتلویح ج ۲ ص ۱۷ ۲ ایضاً ۳ رزین

لرسالة وان اجتهد وافرائهم اصوب لانهم شاهدوا موارد النصوص ولتقدمهم في الدين وبركة صحبة النبي صلى الله عليه وسلم وكونهم في خير القرون[1] لانهم شاهدوا احوال التنزيل واسرار الشريعة[2] ومعرفة اسباب التنزيل[3]

کیا ہے تو انکی رائے زیادہ صائب ہے کیونکہ انھوں نے نصوص کے موقع ومحل کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے، دین میں انہیں تقدم حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے فیضیاب ہوئے ہیں، ان کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ تھا، کیونکہ انھوں نے قرآن مجید کے نزول اور اسرار شریعت کا مشاہدہ کیا ہے، ان کو اسباب تنزیل کی معرفت حاصل ہے،

ان وجوہ کی بنا پر اگر وہ اپنی رائے سے بھی کوئی بات کہتے ہیں تو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بدرجہا فضیلت اور برتری کی مستحق ہوتی ہے،

فقہائے صحابہ سے اخذ واستنباط کے بارے میں ان کے علم وفضل تقوی وطہارت کے لحاظ سے ان کے درجے قایم کیے ہیں، اور ان کے بارہ میں رسول اللہ ص کی شہادت اور قانونی امور میں انکی خصوصیت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ سب انسان یکساں نہیں ہوتے اس لیے سب صحابہ بھی یکساں نہیں تھے، اس لیے قانونی امور میں ان صحابہ کی رائے زیادہ وزنی ہوگی، جنکی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے،

الذين افنوا اعمارهم في الصحبة وتخلقوا باخلاقه الشريفة

صحابہ نے رسول اللہ ص کی صحبت میں اپنی عمریں گذاری تھیں اور آپ کے پاکیزہ اخلاق کے رنگ

[1] توضیح وتلویح ص ۲۵ [2] نور الانوار ص ۲۱۷ [3] حسامی ص ۸۶

كالخلفاء والازواج المطهرات والعبادلة وانس وحذيفة ومن في طبقتهم[1]

میں رنگ گئے تھے، جیسے خلفاء راشدین، ازواج مطہرات، عبادلہ (عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عباسؓ) حضرت انسؓ، حضرت حذیفہؓ اور جو ان کے طبقہ میں ہیں

چنانچہ صحابہ کے اقوال کے بارے میں فقہاء کا یہ مسلک ہے،

قول الصحابي فيما يمكن فيه الرأي يلحق بالسنة لغيره[2]

صحابی کا وہ قول جس میں قیاس اور رائے کی گنجائش ہے غیر صحابی کے لیے سنت کے حکم میں ہوگا۔

یعنی جن میں قیاس کو دخل نہیں ہے، ان میں ان کی اتباع واجب ہے اور جن میں قیاس چل سکتا ہے، ان میں قیاس کرنے کی گنجایش ہے، چونکہ صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہے اس بنا پر امام شافعی ان کی تقلید واجب نہیں کہتے ہیں[3]،

اماموں کا یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کسی معاملہ میں عموم البلوی کی حالت نہ پائی جائے اگر عام ابتلاء کی حالت ہو اور صحابہ کے اقوال اس کے خلاف ہوں تو ان کا قبول کرنا ضروری نہ ہوگا، اس کی دلیل یہ ہے

لا يقبل فيه السنة فلا يقبل هو ما يقبل يشبهه به[4]

ایسی حالت میں سنت نہ قبول کیجائے اسلیے جو چیز سنت کی مشابہت کی وجہ قبول کی گئی ہے وہ بدرجہ اولیٰ نہ مقبول ہوگی،

تابعین کے اقوال کے ساتھ فقہا کا طرز عمل

صحابہؓ کے بعد تابعین کا درجہ ہے، جس پر آیت قرآنی "الذین اتبعوھم باحسان" (جنھوں نے نیکی اور خلوص کے ساتھ صحابہ کا اتباع کیا) اور

[1] شرح مسلم ص ۲۴۱ [2] ایضاً ص ۲۴۱ [3] نور الانوار وغیرہ [4] توضیح تلویح ص ۱۷۱

حسب ذیل حدیث نبوی شاہد ہے

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم[1] — میری امت کا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

اس بنا پر فقہاء نے تابعین کے اقوال و آراء سے بھی استفادہ کیا ہے، اور جن تابعین کے فتاوی صحابہ کے زمانہ میں مشہور ہوئے اور تسلیم کیے گئے، جیسے قاضی شریح اور حضرت مسروق وغیرہ، ان کو اخذ و استنباط میں مثل صحابی کے قرار دیا ہے۔ لیکن صحابہ کے مقابلہ میں تابعین کے اقوال میں وسعت سے کام لیا ہے، اور ان کے قول کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دی ہے، اور وقت و ضرورت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان کے بارہ میں نحن رجال وھم رجال (جیسے ہم ہیں ویسے وہ تھے) کہا گیا ہے،

یہ واضح رہے کہ مذکورۂ بالا عنوان میں رائے کا مفہوم قیاس والی رائے سے وسیع تر ہے، اس میں استحسان استصلاح وغیرہ کی صورتیں اور وقتی و ہنگامی رائیں سب داخل ہیں،

عرف و رواج

فقہ اسلامی کا گیارہواں ماخذ عرف و رواج ہے۔

عرف و رواج کو فقہ کی نشو و نما میں کافی دخل ہے

یہ نہایت قدیم ماخذ ہے اور تقریباً ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے، فقہ اسلامی کے نشو و نما میں اس کو بڑا دخل ہے، عرب اور غیر عرب کے بہت سے عرف و رواج جو الٰہی پالیسی اور اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف نہ تھے اور قرآن و سنت کی تصریحات ان کے بارے میں خاموش تھیں، ان کو صحابہ و تابعین نے اور ان کے بعد فقہاء نے باقی رہنے دیا اور ترتیب و تدوین کے زمانہ میں وہ فقہ اسلامی کا جزو قرار پائے،

اسلام سے پہلے کی جتنی چیزیں زمانۂ اسلام میں باقی رہیں، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سب پہلے کی شریعتوں بالخصوص شریعت ابراہیمی سے ماخوذ و مستنبط تھیں، نہایت مشکل ہے یہ کیسے

[1] بخاری و مسلم از مشکوٰۃ باب مناقب الصحابہ۔

ہو سکتا ہے کہ عرب اور غیر عرب میں کسی دوسری ملت کے معقول رواج کا وجود ہی نہ رہا ہو یا معاشرتی فلاح و بہبود سے متعلق کوئی عملدرآمد اور عرف پایا ہی نہ جاتا رہا ہو، مثلاً دیت (خون کا معاوضہ) سو اونٹ رائج تھی، جس کو عبد المطلب نے (رسول اکرمؐ کے دادا) نے ایک کاہنہ عورت کی تجویز پر قبول کیا تھا[1]، وہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں بدستور رائج رہی اور فقہ میں اس باب کے پورے مسائل اسی پر مبنی ہیں،

حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی عرب جاہلی کے بعض رسم و رواج کو اسلامی شریعت کا تشریعی مادہ قرار دیا ہے ھی مادۃ تشریعہ[2]۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے:

ونھی عن الرسوم الفاسدۃ و امر بالصالحۃ[3] — رسول اللہ نے فاسد رسموں سے منع کیا اور اچھی رسموں کے قبول کرنے کا حکم دیا۔

اصل یہ ہے کہ وہ تمام عرف و رواج جو الٰہی پالیسی (منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ) کے موافق تھے، وہ سب قبول کیے گئے، خواہ وہ عرب میں رائج رہے ہوں یا غیر عرب میں یا ان کا تعلق ماقبل کی شریعتوں سے تھا یا نہ تھا،

عرف و رواج کی تعریف

فقہاء نے عرف و رواج کی یہ تعریف کی ہے،

عادۃ جمہور قوم فی قول او عمل — قول یا عمل میں جمہور کی عادت کا نام عرف ہے

عرف کا دوسرا نام تعامل اور عادت بھی ہے۔

التعامل وھو عادۃ الناس فی المعاملات من البیع والشراء وغیرھما[4] — خرید و فروخت اور دوسرے معاملات میں لوگوں کی عادت کا نام "تعامل" ہے۔

[1] امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی ص ۲۶ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳ [3] ایضاً ص ۱۴۴، [4]

عادت کی تعریف میں یہ منقول ہے:

العادة عبارة عما يستقر فى النفوس من الامور المتكررة المقبوله عند الطباع السليمة[1]

عادت اس کو کہتے ہیں کہ جو باتیں طبیعت سلیمہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور انھیں بار بار کرنے سے انسان کے اندر وہ جگہ پکڑ لیں۔

فقہاء کا قول عادت کے بارے میں یہ ہے:

العادة تجعل حكماً اذا لم يوجد التصريح بخلافه فاما عند وجود التصريح بخلافه يسقط اعتباره[2]

اگر قرآن اور سنت میں اس کے خلاف تصریح نہ ہو تو "عادت" ہی کو حکم (فیصلہ کرنے والا) بنایا جائیگا اور اگر خلاف تصریح موجود ہو تو عادت کا اعتبار نہیں۔

قرآن و سنت سے ثبوت قرآن حکیم میں اس کی بنیاد درج ذیل آیت بن سکتی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (۷/۱۹۹)

عفو و درگذر سے کام لیجئے عرف کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے نہ الجھیے۔

مفسرین کے نزدیک تمام عقلی و رواجی اچھی باتیں داخل ہیں اس لیے اس عموم میں مذکورہ اصطلاحی عرف بھی داخل سمجھا جائے گا۔ ذیل کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انتم اعلم بامور دنياكم

تم لوگ اپنے دنیوی امور سے زیادہ واقف ہو،

ایک موقع پر حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا:

ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وما رآه المسلمون قبيحا فهو عند الله قبيح[3]

جس کو جمہور مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے، اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے،

[1] الاشباہ والنظائر ص ۴۴، [2] شرح سیر کبیر ج ۱ ص ۱۹۸

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہ عام اصول انھیں باتوں میں نافذ ہوگا جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہوں اور جو اس کے خلاف ہوں گی ان میں اس کو نہ مانا جائے گا۔

فقہا کے نزدیک عرف کا مقام فقہاء نے عرف و رواج کو نہایت اونچا درجہ دیا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں:

الثابت بالعرف كا لثابت بالنص[2]

جو چیز عرف سے ثابت ہے وہ نص سے ثابت کے مثل ہے،

الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعى[3]

جو عرف سے ثابت ہے وہ شریعت میں دلیل شرعی سے ثابت سمجھا جائے گا۔

فقہا نے بہت سے مسائل میں عرف و رواج ہی کو مدار بنا کر حکم جاری کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ان يفتى على عرف اهل زمانه وان خالف زمان المتقدمين[4]

فتوی اہل زمانہ کے عرف کے مطابق دیا جائے خواہ وہ متقدمین کے زمانہ کے خلاف ہو،

عرف کے اعتبار کیلئے ضروری نہیں ہے کہ اس پر ہر ہر فرد کا عمل ہو، بلکہ غالب اکثریت کا عمل کافی ہے۔ ایسی صورت میں بھی مفتی اور قاضی کو عرف کے خلاف فتوی دینا اور فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے:

انما تعتبر العادة اذا اطردت وغلبت[5]

جب عادت بڑھ جائے اور غالب آجائے تو اس وقت اسکا اعتبار کیا جائے گا۔

عرف کی دو قسمیں فقہاء نے عرف کی دو قسمیں بیان کی ہیں (۱) عرف خاص اور (۲) عرف عام،

عرف خاص: جو کسی خاص علاقہ یا پیشہ اور کاروباری طبقہ میں رائج ہو، عرف عام: جو عمومی حیثیت سے رائج ہو کسی خاص طبقہ و علاقہ کے ساتھ مخصوص نہ ہو،

[1] مجموعہ رسائل ابن عابدین ص ۱۲۰ [2] شرح سیر کبیر ج ۱ ص ۱۱۵ [3] مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۵ [4] رد المحتار [5] الاشباہ والنظائر ص ۶۵ [6] مجموعہ ص ۱۱۵

عرف کے اعتبار کرنے کی تفصیل

مگر یہ عرف اسی صورت میں معتبر مانا جائے گا جب

(۱) عرف قرآن و سنت کے حکم کے خلاف نہ ہو کہ عرف پر عمل کی صورت میں قرآن و سنت کا ترک لازم آئے۔ ایسی صورت میں تو عرف پر عمل نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سنت ہی پر عمل ہوگا۔

البتہ جو صورت عرف و رواج ہی پر مبنی ہو تو عرف بدلنے سے حکم بھی بدل جائے گا، لیکن اس وقت بھی عرف کی یہ حیثیت نہ ہوگی کہ وہ قرآن و حدیث کے فیصلہ کو بدل دے بلکہ اس صورت میں یہ کہا جائیگا کہ سابق حکم عرف پر مبنی ہونے کیوجہ سے اتنی ہی مدت تک کے لیے تھا جبتک وہ عرف باقی ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کو وزنی (وزن سے بیچی جانے والی چیزیں) شمار کر کے اسکا حکم بیان فرمایا تھا مگر اب وہ کیلی (ناپ سے بیچی جانے والی چیزیں) بن گئی ہیں، یا آپ نے کیلی ہونے کی وجہ سے ان کا حکم بیان فرمایا تھا، اور اب وہ وزنی بن گئی ہیں تو ان چیزوں میں عرف کی وجہ سے حکم کی تبدیلی ضروری ہوگی۔

(۲) عرف قرآن و سنت کے عام حکم کے خلاف نہ ہو بلکہ حکم کے کسی خاص جزو میں مخالفت ہوتی ہو تو ایسی صورت میں عام حکم سے اس خاص کو عرف کی بنا پر مستثنیٰ قرار دیں گے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز کی خرید و فروخت کرنا ناجائز قرار دیا ہے، جو بیچنے والے کے پاس موجود نہ ہو، لیکن موچی سے جو معاہدہ جوتے کا کیا جاتا ہے، اس میں جوتا موچی کے پاس موجود نہیں ہوتا ہے، بلکہ بعد میں وہ بنا کر دیتا ہے۔ فقہاء نے عرف کی بنا پر اس صورت کو جائز قرار دیا ہے،

(۳) عرف اگر قیاسی حکم کے خلاف ہو تو قیاس چھوڑ کر عرف پر عمل کیا جائے گا۔ خواہ عرف خاص ہو یا عام[۱]۔

(۴) جو احکام محض عرف پر مبنی ہوں وہ عرف کے بدلنے سے بدل جائیں گے، کیونکہ ان کی مدت عرف کی بقاء تک ہی تھی،

---

[۱] ملاحظہ ہو مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۶

اماموں کے اختلافی مسائل میں بڑی حد تک عرف ہی کو دخل ہے، ایک زمانہ کا عرف کچھ تھا بعد میں وہ بدل گیا، یا ایک جگہ کا عرف کچھ تھا اور دوسری جگہ کچھ، ان صورتوں میں احکام کا اختلاف ناگزیر ہے، ورنہ فقہ کو اسلام کی بنیادی پالیسی کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کرنا مشکل ہو جائیگا۔

عرف کے اعتبار کے لیے خالص دنیوی قانون کی مقرر کردہ شرطیں

لیکن عمومی حیثیت سے ہر عرف و رواج کو قانونی حیثیت دیدینا قطعاً جائز نہیں ہے، ورنہ قرآن و سنت کے حدود و قیود کی کوئی حیثیت نہ باقی رہے گی، خالص دنیوی قانون نے بھی مطلقاً رسم و رواج کو ماخذ نہیں قرار دیا ہے، بلکہ اس کے حدود و قیود اور شرائط مقرر کی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) معقولیت، رسم و رواج کا معقول ہونا ضروری ہے، اسی بنا پر قانونی مقولہ ہے کہ رسم بد قابل منسوخی ہے، اور رسم کو اقتدار مطلق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ اقتدار انصاف اور رفاہ عام کے ساتھ مشروط ہے، یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے حق میں انصاف ہوتا ہے، اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔

(۲) واجبی رائے، رسم و رواج کو اپنے عقیدہ میں لوگ واجب اور ضروری سمجھتے ہوں، اگر محض فعل اختیاری جیسی حیثیت ہوگی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۳) رسم و رواج کا قانون موضوعہ کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون اور رسم میں موافقت ہونا ضروری ہے یا کم سے کم اس کے مخالف اور مغائر نہ ہونا چاہیے،

(۴) مدت مدید - زمانۂ دراز تک جاری رہنا ضروری ہے، پہلے تو یہ شرط تھی کہ رسم اتنی پرانی ہو کر اس کے قائم ہونے کا زمانہ لوگوں کو یاد نہ رہا ہو، لیکن بعد میں اس قدر تخفیف کر دی گئی کہ معین رواج اور اس پر عوام کا عمل درآمد ثابت ہو جانا کفایت کرتا ہے، لیکن رسم خاص کو مؤثر بنانے کے لیے اب بھی مدت اجراء کا ثابت کرنا ضروری قرار دیا جاتا ہے (مذکورہ مدت کی قید کلیسائی قانون نے رومی قانون سے لیا تھا)

(۵) مطابقت قانون عام۔ اگر رسم و رواج پرانا نہ ہو تو اس میں اور قانون عام میں مغایرت نہ ہونی چاہیے، اس شرط کا تعلق رسوم جدیدہ سے ہے[1]،

لیکن فقہا نے غالباً عرف و رواج کے رائج ہونے کی مدت کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے بلکہ جس چیز کو لوگوں میں رواج کی پوزیشن حاصل ہو جائے۔ اس پر اس لفظ کا اطلاق ہوگا اور اس کے احکام جاری ہوں گے۔ اس کیلئے نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے زمانہ سے رائج ہو اور نہ اس کا اعتبار ہے کہ چند آدمیوں کی محدود جماعت کا اس پر عمل ہو، فقہ کی کتابوں میں ہے

لاعبرۃ بالعرف الطاری[2] عرف طاری کا اعتبار نہیں ہے

ایک ملک یا ایک مقام کے عرف و رواج پر دوسرے ملک اور مقام والوں کو عمل کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ وہاں کے عرف و رواج کی مناسبت سے وہاں والوں کے لیے دوسرے احکام ہوں گے۔

عرف و رواج کی چند اور صورتیں عرف شرع اور عرف اہل زمانہ میں جب تعارض (ٹکراؤ) ہو تو عرف اہل زمانہ کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور عرف شرع کا نہ کیا جائے گا۔ فقہا نے یمین (قسم) کے باب میں بالخصوص اس تقدم کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے قسم کھائی کہ فرش یا دری پر نہ بیٹھے گا۔ لیکن اس کے بعد وہ زمین پر بیٹھا تو اس صورت میں وہ حانث (قسم توڑنے والا) نہ قرار پائے گا، حالانکہ قرآن کریم (عرف شرع) میں زمین کو فرش کہا گیا ہے۔ الذی جعل لکم الارض فراشاً (بقرہ)۔ اسی طرح کسی نے گوشت کھانے کی قسم کھائی، لیکن مچھلی کھائی تو باوجود اس کے کہ قرآن حکیم (عرف شرع) میں مچھلی کو گوشت کہا گیا ہے، لتاکلوا منہ لحما طریا (النحل) لیکن عرف کی وجہ سے وہ حانث (قسم توڑنے والا) قرار پائے گا، فقہا نے اس قاعدۂ کلیہ سے

[1] اصول قانون ج ۱ ص ۲۳۸ تا ۲۵۲ مصنف سرجان سامنڈ۔ [2] ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر ص۔،

چند مستثنیات بھی بیان کی ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے[1]،

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو رواج اور عادتیں لوگوں میں ہمیشہ سے رائج ہیں، فقہاء نے ان کی دو قسمیں کی ہیں: (۱) اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں شرعی دلیل موجود ہے، (۲) شرعی دلیل تو موجود نہیں ہے، لیکن وہ عام طور پر مروج ہے، پہلی صورت کا حکم ظاہر ہے کہ دیگر امور شرعیہ کی طرح اسکے جواز و عدم جواز کا فیصلہ شرعی حکم ہی سے ہوگا۔ محض عادت اور رواج کی وجہ سے بری چیز اچھی نہ قرار پائے گی، اور نہ اچھی چیز بری بنے گی، البتہ دوسری قسم میں یہ گنجایش ہے کہ کبھی تو اس پر عمل درآمد باقی رکھا جاتا ہے، اور کبھی ختم کر دیا جاتا ہے، فقہا نے اسکی کئی شکلیں بیان کی ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھنی چاہیے[2]،

(باقی)

[1] الاشباہ والنظائر ص ۴۷، [2] الموافقات وغیرہ

مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی ایچ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

اسلام کی بنیادی تعلیم اور حصول علم کی ترغیب

اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید ربوبیت" ہے، اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیشمار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول
اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ	مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی
اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء)	بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو۔

اور یہی پیغام لیکر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ	پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے،
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ)	تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ	اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (بقرہ)	نہیں اسکے سوا، بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا،

قرآن اس "توحید ربوبیت" کو ایک تکوینی حقیقت ہی بتا کر نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اپنے متبعین کو ایجابی طور

حکم دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ کی عبادت سے اپنے کو بچائیں

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل) اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوا،

وہ کسی طرح اس بات کو نظرانداز نہیں کر سکتا کہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکائیں، یہ ایسا جرم ہے جو ناقابل عفو ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ	بیشک اللہ نہیں بخشتا ہے اس کو جو اس کا شریک
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ	کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ	اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ
ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء)	بہک کر دور جا پڑا۔

یہ "توحید ربوبیت" اسلام کی پوری تعلیم کا سنگ بنیاد ہے اور یہی "توحید ربوبیت" اسلامی ثقافت اور اسلامک کلچر کا اصل الاصول ہے: "یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ بالفاظ دیگر اللہ رب العزۃ کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں بلکہ سب اس کے محکوم ہیں۔ کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا یہ احساس اس کی اخلاقی بلندی اور خودی و خودداری کا ضامن ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس کے واسطے پیدا کی گئی،

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی	وہی ہے جس نے پیدا کیا تمھارے واسطے
الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ)	جو کچھ زمین میں ہے سب،

اور انسان صرف خالق کائنات کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا	اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو
لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات)	اپنی بندگی کو۔

اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ پیروانِ اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور کائنات کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں۔

اسی کا نام تسخیر کائنات ہے جس کے لیے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگائے تمھارے لیے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ)

اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمھارے دریا کو کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو اور کام میں لگا دیا تمھارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں،

لیکن کائنات کی زندہ اور بیجان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی، ہاتھی کو اٹھا کر نہیں پٹکا جا سکتا بلکہ انکس کے ذریعے قابو میں لایا جا سکتا ہے، دریا کا زور ہاتھوں سے پانی کو جھکولے دیکر نہیں توڑا جا سکتا، بلکہ ٹربائن کے ذریعہ اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا، بلکہ ڈائنامیٹ کے ذریعے اس میں شگاف بلکہ سرنگیں کھودی جا سکتی ہیں، سمندر کی لہروں کے سامنے نہیں ٹھہرا جا سکتا بلکہ کروزر اور سب میرین کے ذریعے طوفانی سمندروں میں بھی بےخطر سفر کیا جا سکتا ہے، یہ سب کیا ہے، صرف تسخیر ارض و سموات اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت، اسی کا نام طبیعیاتی علوم اور نیچرل سائنس ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے دینی علوم کے ساتھ جو آنے والی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہیں

طبیعیاتی علوم کے حصول کو بھی ضروری سمجھا، ان کے رسول کا حکم تھا

اطلبوا العلم ولو کان بالصین

علم کو تلاش کرو خواہ وہ چین میں ملے،

ظاہر ہے یہ چین اور جاپان میں حاصل ہونے والا علم "اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا علم" تو ہوگا نہیں، اس کے لیے تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کافی تھی، بلکہ یہ صرف دنیوی علم ہی ہو سکتا ہے اور ممکنہ غلط فہمیوں سے تحفظ کے لیے پیغمبر اسلام نے یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ علم و حکمت میں کسی طرح کا امتیاز نہیں ہو سکتا، وہ مرد مومن کا ورثہ اور اس کی متاع گم گشتہ ہے، جہاں ملے اس کے لے لینے کا حقدار ہے، ترمذی کی حدیث ہے:

كلمة الحكمة ضالة المومن اينما وجدها فهو احق بها

عقل و دانش کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی ملے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے،

اپنے رسول کے اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے صرف کشور کشائی ہی کے لیے بحر و بر نہیں ناپے، بلکہ انھوں نے علم و حکمت کے موتیوں کی تلاش میں بستیاں اور ویرانے چھان ڈالے،

عرب میں علم و حکمت کی ابتدا

عرب کو جس میں اسلام مبعوث ہوا، اپنے علم پر نہیں بلکہ جہل پر ناز تھا، عمرو بن کلثوم فخریہ کہتا ہے:

الا لا یجهلن احد علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا

بعثت اسلام کے وقت پورے ملک میں کل سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے، عربوں کی لغت شاہد ہے کہ وہ نہ کتاب سے واقف تھے نہ تحریر و کتابت سے، حتی کہ پیغمبر اسلام بھی رسمی کتاب کے مفہوم سے ناآشنا تھے، جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے

ما کنت تدری ما الکتٰب (شوریٰ)

تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب،

ہاں اہل عرب کتاب کے بجائے "کتيبة" کو خوب جانتے تھے جس کے معنی لشکر ہیں، مگر خدا کی قدرت

دیکھیے کہ اسی وحشیانہ لفظ سے ان کے یہاں وہ لفظ بنا جو تہذیب و ثقافت کی کلید ہے، یعنی "کتاب" چنانچہ قاضی بیضاوی نے کتاب کے اشتقاق کے بارے میں لکھا ہے: "واصل الکتب الجمع ومنہ الکتیبۃ"

صحرانشین عربوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے ان کے اندر ان ہی میں سے ایک رسول علم و حکمت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ	اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں
بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ	رسول ان ہی میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی،
یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ	اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے اور
الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران)	سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات،

اسی برکت عظمیٰ کے طفیل میں وہ کتاب و سنت اور علم و حکمت سے آشنا ہوئے اور پھر وہ زمانہ آیا کہ اپنی سعی پیہم سے متمدن دنیا کے استاد قرار پائے، اسلام نے حصول علم کے ساتھ تحریر و کتابت کے سیکھنے پر بھی زیادہ زور دیا ہے اور اپنے متبعین کو ایجابی طور پر حکم دیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں "لکھنے" سے کام لیں،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ	اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو
بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ	ادھار کا کسی وقت مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو
وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ	اور چاہیے کہ لکھ دے تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا

اس طرح نوشت و خواند مسلمانوں کا ایک دینی فریضہ بن گیا، اس میں مرد عورت، شریف و وضیع اور امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلامی معاشرے میں تعلیم اور نوشت و خواند عام ہو گئی، حالانکہ اقوام قدیمہ نے عموماً تعلیم کو صرف مخصوص طبقات میں محدود کر دیا تھا، اور دوسرے طبقات کو اس سے محروم قرار دیا تھا، لیکن اسلام نے اللہ کی اس نعمت کی تقسیم میں کسی بخل کو روا نہ رکھا۔

مسلمانوں میں جو پہلی کتاب مدون ہوئی وہ "اللہ کی کتاب" تھی، قرآن مجید عہد رسالت میں مرتب ہو گیا تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں کتابی صورت میں مدون ہوا، اور عہد عثمان میں اس کی باضابطہ نقول بلاد اسلامیہ میں بھیجی گئیں، اس کے بعد شمع رسالت کے پروانوں نے اپنے ہادی و رہنما کے اقوال و اعمال کو قلمبند کیا، حدیث کے ان قدیم مجموعوں میں حضرت انس بن مالک، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجموعے زیادہ مشہور ہیں۔

دوسرے علوم میں سب سے پہلے علم تاریخ کی کتابیں لکھی گئیں، حضرت امیر معاویہؓ کو تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، انھوں نے مشہور مورخ عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر تاریخ کی کتابیں لکھوائیں[1]، دوسرے مشہور مورخین صحار العبدی، عوانہ بن الحکم اور حماد وغیرہ تھے، زیاد بن ابیہ نے جو امیر معاویہؓ کے زمانے میں عراق کا گورنر تھا، اپنے بیٹے کے لیے ایک کتاب "مثالب العرب" لکھی[2]، اسی زمانہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشارے سے ابوالاسود دؤلی نے علم نحو مرتب کرنا شروع کیا[3]، دوسری صدی ہجری میں علم کلام کی بنیاد پڑی، اس کے قدیم ترین نمائندے واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید ہیں، وہ دونوں کثیر التصانیف تھے[4]۔

طبیعیاتی علوم کا آغاز

ابھی پہلی صدی کی تین چوتھائی بھی نہ گزری تھی کہ دوسری زبانوں سے طبیعیاتی علوم کے ترجمے بھی عربی میں ہونا شروع ہو گئے، اور سب سے پہلے خالد بن یزید نے مصر سے یونانی حکماء کو بلا کر کیمیا اور طب و نجوم کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں، ابن الندیم کہتا ہے:

کان خالد بن یزید بن معاویہ	خالد بن یزید بن معاویہ "مروانی خاندان کا
یسمّی حکیم آل مروان وکان فاضلاً	فلسفی" کہلاتا تھا، وہ خود فاضل تھا اور

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۳۱ [3] ایضاً ص ۶۰ [4] ایضاً تکملہ ص ۱

فی نفسہ ولہ ھمۃ ومحبۃ للعلوم	اسے علم وحکمت کی ترقی سے شوق تھا، اسے کیمیا
خطر ببالہ الصنعۃ فامر باحضار	کا شوق پیدا ہوگیا، چنانچہ اس نے یونانی فلسفہ
جماعۃ من فلاسفۃ الیونانیین	کی ایک جماعت کو جو مصر میں رہتی تھی اور عربی
فمن کان ینزل مدینۃ مصر وقد	زبان میں مہارت رکھتی تھی حاضر کرنے کا حکم دیا
تفصح بالعربیۃ وامرھم بنقل	اور انھیں یونانی وقبطی زبانوں سے عربی میں کیمیا
الکتب فی الصنعۃ من اللسان	کی کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور کیا، اور یہ
الیونانی والقبطی الی العربی	اسلامی تاریخ میں ایک زبان سے
وھذا اول نقل کان فی الاسلام	دوسری زبان میں پہلا ترجمہ
من لغۃ الی لغۃ [1]	تھا،

اس کے کچھ عرصہ بعد دیوان خراج فارسی اور رومی زبانوں سے عربی میں منتقل ہوگیا، اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آئندہ ترجمہ کے لیے فضا سازگار ہوگئی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا طبیب خاص عبد الملک بن الجبر الکنانی تھا، وہ پہلے اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ وطب کا ناظم اعلیٰ تھا، بعد میں مسلمان ہوگیا،[2] حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے ماسرجویہ یہودی سے اہرن القس کی کتاب "الکناش" کا جو فن طب میں تھی، محض نفع رسانی خلق کے لیے عربی میں ترجمہ کرایا۔[3]

ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں پہلوی زبان کی کچھ کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔[4]

قاضی صاعد اندلسی نے منطق کے تراجم کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ ارسطو کی قاطیغوریاس کا پہلا ترجمہ بھی اموی عہد ہی میں ہوا تھا۔[5]

نلینو نے لکھا ہے کہ ونیکن کی لائبریری میں نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ موجود ہے جس پر سنہ کتابت ۱۲۵ھ مرقوم ہے

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۳۸ [2] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۱۶ [3] الفہرست ص ۱۴۳ [4] مروج الذہب للمسعودی [5] طبقات الامم ص ۷۷

غرض اموی خلافت کے خاتمہ (۱۳۲ھ) تک جبکہ اسلام کو آئے ہوئے ابھی کل سوا سو برس ہوئے تھے مسلمانوں نے کشورکشائی و ملک گیری کی مشغولیتوں کے باوجود اتنا کام کر لیا جس کی مثال دوسری اقوام کی ثقافتی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔

عباسی خلافت کی ابتداء اور تصنیف وتالیف کا نیا دور

۱۳۲ھ میں امویوں کے زوال پر عباسی خلافت قائم ہوئی، یہ محض حکمراں خاندانوں کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز دروں پر عجم کے حسن طبیعت" کا آغاز تھا، چنانچہ علم وحکمت کی سرپرستی میں عباسیوں نے بڑی خدمات انجام دیں،

پہلا عباسی خلیفہ سفاح ۱۳۶ھ میں مر گیا، اس کے بعد ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا، منصور کا عہد علوم و فنون کے فروغ و ترقی کا آغاز ہے، سیوطی نے ذہبی سے نقل کیا ہے:

قال الذھبی فی سنۃ ثلث و	ذہبی نے لکھا ہے کہ ۱۴۳ھ میں اس زمانہ کے
اربعین ومائۃ شرع علماء الاسلام	علمائے اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کو
فی ھذا العصر فی تدوین الحدیث	مدون کرنا شروع کیا..........
والفقہ والتفسیر.......	علوم کی تدوین و تبویب کثرت کے ساتھ
وکثر تدوین العلم وتبویبہ	ہونے لگی اور علوم عربیہ، لغت اور
ودونت کتب العربیۃ واللغۃ	تاریخ و ایام الناس کے موضوعوں
والتاریخ وایام الناس [1]	پر کتابیں تصنیف ہونے لگیں،

منصور ہی کے زمانہ میں یونانی طب ۱۴۸ھ میں جندی سابور سے بغداد میں داخل ہوئی اس سال منصور سخت بیمار ہوگیا اور جورجس بن جبرئیل طبیب کو جندی سابور سے بلایا گیا، اس کے علاج سے منصور کو صحت ہوئی اس لیے اس نے جورجس کو اپنا طبیب خاص بنا لیا، جورجس نے منصور کے حکم

---

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۷۷

سے بہت سی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے:

جورجس بن جبرئیل کانت له	جورجس بن جبرئیل کو فن طب میں بہت اچھی
خبرة بصناعة الطب	واقفیت تھی ....
... وقد نقل للمنصور کتباً	اس نے منصور کے واسطے بہت سی
کثیرة من کتب الیونانیین	یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔
الی العربی [1]	

اسی زمانہ میں ارسطاطالیسی منطق کا عربی میں باقاعدہ ترجمہ ہوا، قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے

فاما المنطق فاول من اشتهر به	رہی منطق تو سب سے پہلے جو شخص اس حکومت میں
فی هذه الدولة عبد الله بن	اس میں مہارت کے لیے مشہور ہوا وہ عبد اللہ
المقفع الخطیب الفارسی کاتب	ابن المقفع مشہور ایرانی خطیب اور منصور کا
ابی جعفر فانه ترجم کتب ارسطاطالیس	کاتب تھا، اس نے ارسطاطالیسی منطق کی
المنطقیة الثلاثة [2]	پہلی تین کتابوں کا ترجمہ کیا،

عبد اللہ بن المقفع نے منطق کے علاوہ کلیلہ و دمنہ اور خدائی نامہ کا بھی عربی میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ حسب تصریح مسعودی، مانی، ابن دیصان اور مرقیون وغیرہ زنادقہ قدیم کی کتابوں میں بھی پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیں،

حسب تصریح حافظ جلال الدین سیوطی منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب بخشا اور نجوم کے احکام پر عمل کیا[3]، اس کا منجم خاص نوبخت تھا، جب وہ بڑھاپے میں مستعفی ہو گیا، تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو سہل نوبخت منجم باشی ہوا[4]، نجوم و ہیئت کے ساتھ منصور کو جو دلچسپی تھی اسکی

[1] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۲۳ [2] طبقات الامم ص ۷۷ [3] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۰۳ [4] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۲۶۶

وجہ سے اس فن کے جاننے والے اس کے دربار میں سمٹے چلے آرہے تھے۔ ۱۵۶ھ میں ایک ہندوستانی پنڈت سدھانت کا نسخہ لیکر اس کی خدمت میں باریاب ہوا، ابن القفطی نے لکھا ہے۔

وقد ذکر الحسین بن محمد بن حمید	حسین بن محمد بن حمید نے جو ابن الآدمی کے نام
المعروف بابن الآدمی فی زیجه	سے مشہور ہے اپنی بڑی زیج میں جس کا نام
الکبیر المعروف بنظم العقد انه	"نظم العقد" ہے ذکر کیا ہے کہ ۱۵۶ھ میں ایک
قدم علی خلیفة المنصور فی سنة	ہندوستانی پنڈت جو سدھانت (جوتش)
ست وخمسین ومائة رجل من	میں ید طولیٰ رکھتا تھا، خلیفہ منصور کے دربار
الهند القیم بالحساب المعروف	میں حاضر ہوا .... منصور نے
بالسند هند فی حرکات النجوم	اس کتاب (برہم سدھانت) کے عربی میں
...... فامر المنصور بترجمة	ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور اس کی بنیاد پر
ذالک الکتاب الی العربیة وان	ایک کتاب تصنیف کرنے کا حکم دیا جسے عرب
یولف منه کتاب تتخذه العرب	سیارات کواکب کے حساب میں اصل واساس
اصلاً فی حرکات الکواکب فتولی	بنائیں، یہ خدمت محمد بن ابراہیم الفزاری
ذالک محمد بن ابراهیم الفزاری	کے سپرد ہوئی اور اس نے برہم سدھانت
وعمل منه کتابا یسمیه المنجمون	کی مدد سے وہ کتاب مرتب کی جسے ہیئت داں
السند هند الکبیر [1]	اور جوتشی "السند ہند الکبیر" کہتے تھے،

منصور ہی کے زمانہ سے علوم طبیعیہ و ریاضیہ کا آغاز ہوتا ہے، اس نے قیصر روم سے یونانی علوم کی کتابیں منگائیں، جنھیں پڑھ کر مسلمانوں کا شوق اور بڑھ گیا، ابن خلدون نے لکھا ہے،

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء، لابن القفطی ص ۱۷۷

فبعث ابو جعفر المنصور الی	ابو جعفر منصور نے قیصر روم کو لکھا کہ وہ ریاضی
ملک الروم ان یبعث الیہ کتب	(Mathematics) کی کتابیں
التعالیم مترجمة فبعث الیہ	ترجمہ کرا کر بھیجدے، چنانچہ قیصر نے اصول اقلیدس
بکتاب اوقلیدس وبعض کتب	اور طبیعیات کی کچھ کتابیں منصور کو بھیجیں، مسلمانوں
الطبیعیات فقرأ المسلمون واطلعوا	نے انھیں پڑھا اور ان کے مضمون پر مطلع ہوئے
علی ما فیہا وازدادوا حرصاً	اور ان علوم میں جو کتابیں باقی رہ گئی تھیں،
علی الظفر بما بقی منہا[1]	انھیں حاصل کرنے کے لیے ان کا شوق بڑھ گیا،

اس طرح منصور کے زمانہ میں سب سے پہلی مرتبہ اقلیدس کا عربی میں ترجمہ ہوا، اور مسلمان یونانی ہندسہ کے اس لافانی شاہکار سے واقف ہوئے،

منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوا، اس کا عہد حکومت زنادقہ و ملاحدہ کی دار و گیر میں گزرا، ان کی ملحدانہ تحریکات کے توڑنے کے لیے اس نے متکلمین کو بلا کر ان کے رد میں کتابیں لکھوائیں، ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں قاطیغوریاس، باری ارمیناس اور انالوطیقا کا پہلوی سے عبد اللہ بن المقفع نے ترجمہ کیا تھا، مہدی کے زمانہ میں ابو نوح کاتب نصرانی نے دوبارہ ان کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا، ابو نوح نے ان کے علاوہ ارسطو کی طوبیقا (کتاب الجدل) کا بھی ترجمہ کیا،[2] مہدی نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کو بھی جاری رکھا، اس کا خاص منجم حسب تصریح ابن القفطی توفیل بن توما نصرانی تھا جو الرہا کا رہنے والا تھا،[3]

مہدی کے بعد ۱۶۹ھ میں اس کا بیٹا ہادی خلیفہ ہوا مگر سال ہی بھر بعد مرگیا، اور ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید سریر آرائے خلافت ہوا، اس کے عہد حکومت کا نصف اول برامکہ کے عروج و زوال کی داستان ہے،

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶ [2] معارف جلد ۸۰ نمبر ۱ (جولائی) ص ۴۳ [3] اخبار العلما و باخبار الحکما، ص ۷۷

برمکی خاندان کشمیری نژاد تھا، اس کے مورث اعلیٰ بلخ کے مشہور بدھ مٹھ "نوبہار" کے متولی تھے، بعد میں یہ خاندان مشرف باسلام ہوگیا، علم دوستی و علماء نوازی اس خاندان نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی تھی، اس کی علمی سرپرستی نے بغداد کو "دانشکدۂ مشرق" بنادیا، ان ہی کے زمانہ سے ہندوستانیات (Indology) کا آغاز ہوتا ہے[1]، برامکہ نے ہندوستانی طب کو مسلمانوں میں متعارف کرانے پر بھی توجہ کی اور ان کی ترغیب سے وید ک کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔[2]

برامکہ ہی کی علم دوستی سے یونانی طب کو دربار بغداد میں از سر نو بار ملا۔ ۱۷۱ھ میں ہارون شدید درد سر کے عارضہ میں مبتلا ہوا، جب اطبائے دربار مایوس ہوگئے تو یحییٰ بن خالد کے مشورہ سے جورجس کے بیٹے بختیشوع کو جندی سابور سے طلب کیا گیا، اس کے علاج سے ہارون اچھا ہوگیا، اس کے صلے میں اس نے بختیشوع کو رئیس الاطباء مقرر کیا،[3] اس کے بعد یہ عہدہ اس کے بیٹے جبرئیل کو ملا جو طب کے علاوہ منطق کا بھی جید عالم تھا، جبرئیل نے منطق میں جالینوس کی کتاب البرہان کے ایک بڑے حصے کو تلاش کرکے عربی میں ترجمہ کرایا،[4] وہ خود بھی طب کے ساتھ منطق میں صاحب تصانیف تھا، دوسرا مشہور طبیب یوحنا بن ماسویہ تھا، جو کامیاب طبیب ہونے کے ساتھ جید عالم بھی تھا، جب ہارون کو غزوۂ روم میں انقرہ اور عموریہ میں یونانی کتابیں ملیں تو اس نے یوحنا ہی سے ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا،[6] یوحنا ہی کا شاگرد حنین بن اسحاق تھا جو تاریخ اسلام کا سب سے بڑا مترجم ہے،[5]

ہارون کا عہد اس لیے بھی مشہور ہے کہ اس کے زمانہ میں سب سے پہلے سرکاری لائبریری "خزانۃ الحکمۃ" کے نام سے قائم کی گئی، پھر بعد میں اس کا نام بیت الحکمۃ ہوگیا،[1] اس کا پہلا لائبریرین ابو سہل فضل بن نوبخت تھا،[8] بعد میں سلما اس عہدہ پر مقرر ہوا، اور وہ تاریخ میں "سلما صاحب بیت الحکمۃ" کے نام سے مشہور ہے،

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۴۸۴ [2] ایضاً ص ۴۲۱ [3] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۲۶ [4] ایضاً ص ۱۰۰ [5] ایضاً ج ۱ ص ۱۳۳ [6] ایضاً ص ۱۷۵ [7] ایضاً ص ۲۰۷ [8] اخبار العلما باخبار الحکما ص ۱۶۹،

بیت الحکمۃ کی سرکاری لائبریری کے علاوہ برامکہ کی ذاتی لائبریری بھی تھی، اس کی ثروت کے بارے میں جاحظ نے یحییٰ بن خالد برمکی کے بیٹے موسیٰ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس لائبریری میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس کے تین تین نسخے نہ ہوں،[1]

ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں [قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا] کے دو ترجموں کا ذکر اوپر آچکا ہے، پہلا ترجمہ عبد اللہ بن المقفع نے کیا تھا، اور دوسرا ترجمہ ابو نوح کاتب نصرانی نے، ہارون کے عہد خلافت میں تیسرا "ترجمہ" سلما صاحب بیت الحکمۃ" نے یحییٰ بن خالد برمکی کے ایما سے کیا،[2]

برامکہ کا نام خاص طور سے ریاضی و ہیئت کے سلسلے میں مشہور ہے، ان کے اعتناء سے "المجسطی" عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن الندیم لکھتا ہے:

اول من اعتنی بتفسیرہ واخراجہ	سب سے پہلے جس شخص نے مجسطی کی تفسیر اور عربی میں اسکا
الی العربیۃ یحیی بن خالد بن برمک	ترجمہ کرانے کے ساتھ اعتنا کیا وہ یحیی بن خالد برمکی تھا،
نفسرہ لہ جماعۃ فلم یتقنوہ و لم	ایک جماعت نے اس کے لیے مجسطی کی تفسیر کی مگر وہ اس کام
یرض ذلک. فندب لتفسیرہ ابا	کو اچھی طرح انجام نہ دے سکے اور یحیی کو انکے تراجم پسند
حسان وسلم صاحب بیت الحکمۃ	نہ آئے اس لیے اس نے اسکی تفسیر کے لیے ابا حسان اور
فاتقناہ واجتھدا فی تصحیحہ بعد ان	سلما صاحب بیت الحکمۃ کو بلایا، انھوں نے اس کام کو بڑی
احضر النقلۃ المجودین فاختبرا نقلھم	اچھی طرح انجام دیا اور اسکی صحت میں سعی بلیغ کی،
واخذا بافصحہ واصحہ وقد قیل	انھوں نے بڑے قابل مترجموں کو بلاکر انکے ترجموں کا امتحان
ان الحجاج بن مطر نقلہ ایضاً[3]	لیا اور جو سب سے زیادہ صحیح اور فصیح تھا اسے منتخب کیا

اور کہا گیا ہے کہ حجاج بن مطر نے بھی مجسطی کا ترجمہ کیا تھا۔

غالباً حجاج بن مطر کے ترجمہ مجسطی کو قبول عام حاصل نہیں ہوا، قدرت کو اس کا نام دوسرے کام کے ذریعہ

[1] کتاب الحیوان للجاحظ جزء اول ص ۳۰ [2] معارف جلد ۸۰ نمبر ۱ (جولائی ۱۹۵۷ء) ص ۳۹ - ۵۵ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۳۴۲

زندہ رکھنا تھا، یہ اقلیدس کا ترجمہ تھا، سب سے پہلے اقلیدس کا ترجمہ منصور کے زمانہ میں ہوا تھا، لیکن یہ مشہور نہیں ہوا، برامکہ کی سرپرستی میں اس کا دوسرا ترجمہ ہوا، اسکا مترجم حجاج بن مطر تھا، ابن الندیم لکھتا ہے:

نقلہ الحجاج بن یوسف بن مطر	حجاج بن یوسف بن مطر نے اقلیدس کے یونانی سے
نقلین احدھما یعرف بالھارونی	عربی میں دو ترجمے کیے، ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے
وھو الاول ونقلہ ثانیاً ویعرف	اور وہ پہلا ترجمہ ہے اور دوسرا ترجمہ نقل مامونی کے
بالمامونی وعلیہ یعول[1]	نام سے مشہور ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے.

۱۸۷ھ میں برمکی خاندان ہارون کے شکوک و شبہات کا شکار ہوکر تباہ ہوگیا، اور اس کے ساتھ علم و ادب کی سرپرستی کا وہ کارخانہ بھی جو ان کی علم نوازی سے چل رہا تھا، درہم برہم ہوگیا، وہ اہل کمال جو برمکی خاندان کی نوازشوں سے فیض یاب ہوکر علم و حکمت کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے تھے بد دل ہوکر خانہ نشین ہوگئے،[2]

چھ سال بعد ہارون نے بھی وفات پائی اور وصیت کے مطابق امین تخت خلافت پر بیٹھا مگر درانداز نے جلد ہی اس کو دوسرے بھائی مامون سے بدظن کرا دیا اور برادرانہ خانہ جنگی شروع ہوگئی، یہ لڑائی محض دو بھائیوں کی جنگ نہ تھی، بلکہ عرب و عجم کا آخری مقابلہ تھا جس میں عجم کو فتح ہوئی اور ۱۹۸ھ میں مامون سریر آرائے خلافت ہوا،

عباسی خلفاء میں مامون کا عہد اپنی عقلیت پرستی اور یونان پسندی کے لیے مشہور ہے، اس کی علمی سرپرستی کے بارے میں قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:

ثم لما افضت الخلافۃ الی الخلیفۃ	پھر جب خلافت ساتویں خلیفہ
السابع منھم عبد اللہ المامون	عبد اللہ المامون کو ملی.......

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۱ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۱ - ۱۶۲

تمم ما بدأ به جده المنصور
فاقبل على طلب العلم فى مواضعه واستخرجه
من معادنه بفضل همته الشريفة
وقوة نفسه الفاضلة فداخل
ملوك الروم واتحفهم بالهدايا
الخطيرة وسألهم صلته بما لديهم
من كتب الفلسفة فبعثوا اليه بما
حضرهم من كتب افلاطون و
ارسطاطاليس وابقراط وجالينوس
واقليدس وبطليموس وغيرهم
من الفلاسفة فاستخار لها مهرة
التراجمة وكلفهم احكام ترجمتها
فترجمت له على غاية ما امكن ثم
حض الناس على قرائتها ورغبهم
فى تعليمها فنفقت سوق العلم
فى زمانه وقامت دولة الحكمة فى عصره[1]

تو اس نے اس تحریک کو جسے اس کے دادا منصور نے
شروع کیا تھا مکمل کیا، اور جن مقامات سے علم حاصل
ہو سکتا تھا اس نے اسے حاصل کرنے پر توجہ کی اور اپنی
ہمت شریفہ اور فاضل نفس کی مدد سے علم و حکمت
کو ان کے معادن سے نکالا، اس غرض سے اس نے
بادشاہان روم سے خط و کتابت کی، انھیں بیش قیمت
تحفے اور ہدیے بھیجے اور ان کے بدلے میں ان سے
فلسفہ کی کتابیں منگائیں، انھوں نے افلاطون،
ارسطو، بقراط و جالینوس اور اقلیدس و بطلیموس
کی جو کتابیں ان کے یہاں تھیں مامون کی خدمت
میں بھیجیں، مامون نے ان کے ترجمے کے لیے ماہر مترجمین
کو منتخب کیا اور انھیں ان کے ترجمہ پر مامور کیا،
اس طرح کمال خوبی کے ساتھ عربی میں ان کا ترجمہ ہوا،
پھر لوگوں کو ان کے پڑھنے پر آمادہ کیا اور ان کی تعلیم
کی ترغیب دی، اس طرح اس کے زمانہ میں علم کا بازار
چالو ہو گیا اور اس کے عہد میں علم و حکمت کی سلطنت قائم ہو گئی

خلیفۂ وقت کی تقلید میں امراء و روساء نے بھی اس علمی تحریک کی ترقی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا، اس کی تفصیل اسلامی ثقافت کے مورخ کا کام ہے، ان میں بنو موسیٰ بن شاکر کا نام خصوصیت سے

[1] طبقات الامم ص ۵۰،

قابل ذکر ہے، وہ خود علم ہندسہ میں یگانہ تھے، اور ان کی کوشش سے یونانی ہندسہ کے بڑے بڑے نوادر عربی میں
ترجمہ ہوئے، اس کی تفصیل آگے آئے گی،

علوم عقلیہ میں مامون کو ہندسہ کے ساتھ اور ہندسہ میں اصول اقلیدس کے ساتھ خصوصی شغف تھا،
کہتے ہیں کہ اس کی عبا کی آستینوں پر اقلیدس (مقالہ اولیٰ) کی پانچویں شکل کا طغرا بنا رہتا تھا، اسی لیے اس شکل
کو "شکل مامونی" کہا جاتا ہے[1]، مامون کی نظر میں اصول اقلیدس کی اتنی اہمیت تھی کہ جو شخص اس کے کامل
تیرہ مقالے پڑھے ہوئے نہیں ہوتا تھا، اس کو وہ مہندس ہی نہیں سمجھتا تھا، ابن القفطی نے لکھا ہے:

وكان عند المامون ان من لم يقرء
هذا الكتاب لا يعد مهندسا البتة[2]

مامون کے نزدیک جو شخص اس کتاب کو ختم کیے
نہ ہوتا تھا وہ مہندس ہی محسوب نہ ہوتا تھا،

مامون کے زمانہ میں حجاج بن مطر نے جس نے پہلی مرتبہ ہارون کے زمانہ میں اقلیدس کا عربی میں ترجمہ
کیا تھا، دوبارہ اس کتاب کا ترجمہ کیا، ابن الندیم کی تصریح اوپر مذکور ہو چکی، نقل ہارونی نایاب ہے،
غالباً محقق طوسی کے زمانہ میں بھی ناپید تھی اس لیے وہ اس کا ذکر نہیں کرتا، نقل مامونی کے بھی چھ مقالے
ہی ملتے ہیں،

ہندسہ کی آیندہ ترقی کا تذکرہ اس کی مختلف شاخوں کے سلسلے میں آگے آرہا ہے، اس سے پہلے اس کے
آغاز پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مسلمانوں میں ہندسہ کی ابتدا

جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے ریاضی و ہندسہ میں ترقی کی، اس کی مثال
تاریخ میں نہیں ملتی، ۱ھ (۶۲۲ء) میں مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد پڑی، ۸ھ میں
جزیرہ نمائے عرب اسلام کے حیطۂ اقتدار میں آیا، ۱۱ھ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر
حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے، ان کا دو سالہ عہد خلافت ارتداد کے فتنہ کو فرو کرنے اور ان بیرونی

[1] تحریر اقلیدس ص ۶ طہران ایڈیشن [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۲۸۸

طاقتوں کی گوشمالی میں صرف ہوا جو در پردہ ان فتنہ انگیزوں کی اعانت کر رہی تھیں، مثلاً ایرانی اسلام کے مٹانے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھیں جیسے روم، اس لیے خلیفۂ اول کی وفات پر ان کے جانشین حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے پیشرو کی فارورڈ پالیسی جاری رکھی اور کچھ ہی عرصے میں قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتوں کا بڑا حصہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا، اور روم و عجم کے خزانے مدینہ منورہ میں منتقل ہونا شروع ہوئے، اس سے بیت المال کی باقاعدہ تنظیم کا مسئلہ پیدا ہوا جس کے لیے حساب دان منتظمین کی ضرورت تھی، دوسری طرف دولت و ثروت کی کثرت کے ساتھ ترکہ کی تقسیم اور مناسخہ کے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے جن کے اطمینان بخش حل کے لیے حساب الکسور میں مہارت ضروری تھی،

ان معاشرتی تقاضوں کی بنا پر مسلمانوں نے علم الحساب کو سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا،

خلافت فاروقی کے آخری زمانے میں سواد عراق کا علاقہ فتح ہوا، جسے خلیفۃ المسلمین نے فاتحین میں تقسیم کرنے کے بجائے قدیم مزارعین ہی کے پاس خراج پر چھوڑ دیا، تشخیص خراج کے لیے زمین کی باقاعدہ پیمایش کرائی گئی اور یہ کام عثمان بن حنیفؓ کے سپرد ہوا جسے انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا،[1] مساحت اور پیمایش زمین کے لیے علم الہندسہ کے مبادی سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے یہ باور کرنا چاہیے کہ مسلمان پہلی صدی ہجری کے ربع اول ہی میں علم ہندسہ کے مبادی سے واقف تھے،

پھر ارتقاء تمدن کے ساتھ عمارتوں کی تعمیر اور نئے شہروں کی آبادی ضروری ہو گئی، یہ ظاہر ہے کہ تعمیر عمارات اور ٹاؤن پلاننگ کے لیے سول انجینرنگ کی مہارت ناگزیر ہے، جس کے لیے علم ہندسہ میں مہارت ضروری ہے، اس لیے یہ یقینی ہے کہ مسلمان پہلی صدی ہجری میں نظری ہندسہ کے مبادی و ادبیات سے واقف ہو چکے ہوں گے،

غرض ابتدا ہی سے مسلمانوں کے لیے حساب و ہندسہ ناگزیر تھا، اور انھوں نے اس معاشرتی تقاضے کو باحسن وجوہ انجام دیا، چنانچہ دوسری صدی ہجری کے نصف اول ختم ہونے سے پہلے "ہندسہ

[1] الاحکام السلطانیہ ماوردی

جاننے والوں" کا باضابطہ ذکر تاریخ میں ملتا ہے، ابن الاثیر ۱۴۵ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے مختلف صوبوں کے حکام کو لکھا کہ ان کے یہاں جو معمار و مزدور اور قابل اعتماد ہندسہ جاننے والے" ہوں انھیں بغداد کی تعمیر کے لیے بھیج دیا جائے،[1]

یہ بھی واضح رہے کہ ۱۶ھ سے (جس سال مصر فتح ہوا تھا) مسلمانوں کو یونانی حکما اور مسیحی علما کے ساتھ (جو یونان کے علمی سرمایہ سے اجمالی طور پر واقف تھے) تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملنے لگا، اس لیے وہ بہت جلد یونانی علم و حکمت کے شاہکاروں سے واقف ہو گئے اور ان کو ان کے حاصل کرنے کا اشتیاق ہو گیا، ابن خلدون لکھتا ہے،

ثم جاء الله بالاسلام	پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مبعوث کیا...... اہل اسلام
وابتداء امرهم بالسذاجة و	کی ابتدا بڑی سادگی اور صنعتوں سے ناواقفیت
الغفلة عن الصنائع حتى اذا تبجح	کے ساتھ ہوئی، پھر جب ان کی عظمت اور شوکت
السلطان والدولة واخذوا من	و حشمت بڑھ گئی اور تہذیب و تمدن سے انھیں وافر
الحضارة بالحظ الذى لم يكن لغيرهم	حصہ ملا جو ان سے پہلے کی قوموں کو نہیں ملا تھا
مع الامم وتفننوا فى الصنائع و	تو انھوں نے مختلف صنعتوں میں دستگاہ حاصل
العلوم وتشوقوا الى الاطلاع هذه	کی اور انھیں علم و سائنس پر مطلع ہونے کا شوق
العلوم الحكمية بما سمعوا من الاساقفة	دامنگیر ہوا کیونکہ انھوں نے قلمرو اسلامی
والاقسة المعاهدين بعض ذكر	کے ذمی مسیحی علما، اور پادریوں سے ان علوم کا
منها وبما تسمو اليه افكار الانسان	کچھ ذکر سنا تھا، اور انسانی فکر بھی ان کے حصول
فبعث ابو جعفر المنصور الى ملك	کی داعی تھی، لہٰذا ابو جعفر منصور نے قیصر روم
الروم ان يبعث اليه بكتب التعاليم	کو لکھا کہ وہ ریاضیات (Mathematic) کی

[1] ابن اثیر ج ۵

مترجمة فبعث الیه بکتاب اوقلیدس — کتابیں ترجمہ کرواکر بھیجدے، چنانچہ قیصر نے اول

وبعض کتب الطبیعیات[1] — اقلیدس اور طبعیات کی کچھ کتابیں منصور کو بھیجیں،

اس طرح ۱۴۵ھ کے قریب اقلیدس کا سب سے پہلی مرتبہ عربی میں ترجمہ ہوا، ہارون الرشید (۱۷۰-۱۹۳ھ)
کے زمانہ میں حجاج بن مطر نے یحییٰ بن خالد برمکی کے ایماء سے اقلیدس کا از سر نو ترجمہ کیا، جب امین و مامون کی
خانہ جنگی کے بعد مامون سریر آرائے خلافت ہوا تو حجاج نے پھر سے اقلیدس کا ترجمہ کیا، اس کے بعد (تیسری اور
چوتھی صدی ہجری میں) ہندسی کتابوں کے بیشمار تراجم ہوئے، اور اس سے زیادہ کثرت کے ساتھ مہندسین
نے خود ہندسی تصانیف مرتب کیں، ان کی تفصیل آگے آرہی ہے،

مسلمانوں کے علم ہندسہ کی تقسیم — علم ہندسہ کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ہندسہ خالص اور تطبیقی ہندسہ،
اول الذکر کی تین ذیلی اقسام ہیں

(۱) اصول ہندسہ (جس سے اقلیدس کے "اصول ہندسہ" (Elements) کے انداز کی ہندسی مصنفات
مراد ہیں) (۲) کرویات (اس میں "علم المثلثات الکرویہ" (Spherical Trignometry) بھی شامل ہے)
(۳) مخروطات اور دیگر غیر فرجاری منحنیات کا ہندسہ (Conics and Higher Curves)

اسی طرح تطبیقی ہندسہ کے سلسلے میں مسلمان فضلاء کی کوششوں کو تین ذیلی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:
(۱) علم الحیل یا میکانک (Mechanics) (۲) علم المناظر یا بصریات (Optics) (۳) فلکیات
یا ہندسی ہیئت (Mathematical Astronomy)

ان میں سب سے زیادہ اعتنا مسلمان مہندسین نے "اصول ہندسہ" کے ساتھ کیا جسے عموماً "اقلیدس"
سے تعبیر کیا جاتا تھا، اس ضمن میں حسب ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:
(۱) اقلیدس کے اصول ہندسہ کا ترجمہ (۲) اقلیدس کے اصول ہندسہ کی تلخیص (۳) اصول ہندسہ پر مستقل تصانیف
(۴) مساحت اور علم المثلثات (۵) اصول اقلیدس کی شروح (۶) مصادرات اقلیدس کی شروح اور شکوک اقلیدس کا حل،

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶

(۷) مصادرۂ توازی خطوط (Parallel Postulate) کی اصلاح (۸) نظریہ نسبت
وتناسب کی شرح و ایضاح (۹) نظریۂ اعداد بالخصوص "اصم" و "منطقات" کی شرح و توضیح
(۱۰) مجسمات خمسہ (Five regular Polyhydra) کے مسائل کی توضیح و تبیین،

کرویات کے ضمن میں مندرجہ ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:
(۱) کرویات ساکنہ (۲) کرویات متحرکہ (۳) علم المثلثات کرویہ

ہندسہ خالص کی تیسری قسم کو دو عنوانوں کے تحت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،
(۱) مخروطات، (۲) غیر فرجاری منحنیات

علم الحیل کے مندرجۂ ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:

۱- حیل (Mechanics)
۲- میزان الحکمۃ یا اسکونیات (Hydrostatics)
۳- علم البنکام یا گھڑی سازی (Horology)

فلکیات کا عنوان چند ذیلی عنوانوں میں منقسم ہو سکتا ہے:-

۱- زیج شہریار (Persian Astronomy) کی تشریح،
۲- السندھند (Indian Astronomy) کی توضیح
۳- المجسطی (Greek Astronomy) کی شرح و اصلاح،
۴- مستقل ہیئتی فنون
۵- اصطرلاب
۶- آلات رصدیہ کی تیاری

(باقی)

امام نسائی اور انکی سنن

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

حافظ ابو عبد الرحمٰن نسائی کے نام سے حدیث و سیر کا ہر طالب علم واقف ہے، حدیث کی جو کتابیں اپنی صحت و وثوق کے اعتبار سے صحاح کا درجہ رکھتی ہیں، ان میں سے ایک امام نسائی کی سنن بھی ہے، لیکن یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مورخین اور اصحاب تذکرہ نے امام نسائی کے ساتھ وہ اعتنا، نہیں کیا جس کے وہ مستحق ہیں، اس لیے ان کے اکثر حالات بڑی حد تک نامعلوم ہیں، اس مضمون میں جو حالات و واقعات تلاش و جستجو سے فراہم ہو سکے ہیں، وہ سنن پر مفصل تبصرہ کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں،

نام و نسب | امام نسائی کا اصل نام احمد اور کنیت ابو عبد الرحمٰن تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار، جمہور نے سلسلۂ نسب اسی ترتیب سے بیان کیا ہے، البتہ علامہ سیوطی نے سنان کے بعد بحر کی جگہ یحییٰ کا نام لیا ہے، سمعانی نے بحر بن سنان لکھا ہے، اور علامہ ابن خلکان نے آپکے والد کا نام علی اور دادا کا نام شعیب قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، ابن جوزی کی المنتظم کے حاشیہ میں ابن خلکان کے سلسلۂ نسب کو مرجوح بتایا گیا ہے،

پیدائش | نسائی کے سنہ پیدائش میں خفیف سا اختلاف ہے، عام طور سے مورخین ۲۱۵ھ یا ۲۱۴ھ قرار دیتے ہیں اور اس میں سے کسی کو ترجیح نہیں دیتے، البتہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اور خیر الدین زرکلی

نے اعلام میں ۲۲۵ھ لکھا ہے، ابن عماد نے شذرات میں سیوطی کا قول نقل کر دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ عام طور سے اصحاب سیر و تذکرہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام نسائی نے ۸۸ سال کی عمر پائی جیسا کہ خود ابن عماد نے بھی اس کی تصریح کی ہے، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ ان کا سنہ پیدائش ۲۱۵ھ کو مانا جائے، امام نسائی خود بھی فرماتے ہیں:

یشبہ ان یکون مولدی فی سنۃ ۲۱۵[1] — قیاس یہ ہو کہ میری پیدائش ۲۱۵ھ میں ہوئی ہو،

وطن | آپ نے اگرچہ مصر کو وطن بنا لیا تھا مگر پیدائش "نساء" میں ہوئی تھی، نسا، کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان فاتحین جب خراسان میں داخل ہوئے تو انھوں نے اس شہر کا بھی قصد کیا لیکن اہل شہر مسلمانوں کی آمد کی اطلاع پا کر اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے، مسلمانوں نے جب وہاں عورتوں کو پایا تو جنگ و قتال کے ارادہ سے باز آگئے، کیونکہ ان کے مذہب میں عورتوں سے جنگ ممنوع ہے، اور یہ کہکر لوٹ گئے کہ جب تک اس شہر کے مرد نہ آئیں ہم اس سے کوئی تعرض نہ کریں گے،[2] ممکن ہے تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح نہ ہو لیکن سمعانی نے کتاب الانساب اور یاقوت نے معجم البلدان میں اسے نقل کیا ہے، امام صاحب اسی شہر کی نسبت سے "نسائی" کہلاتے ہیں، اور زیادہ صحیح نسبت اس شہر کی طرف یہی ہے، لیکن "نسوی" بھی کہا جاتا ہے،[3]

"نساء" ایک زمانہ میں اہل علم اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے، اور اس کی خاک سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء پیدا ہوئے، اسی شہر کو امام نسائی کے مولد و منشاء ہونے کا فخر حاصل ہے اور امام صاحب نے اگرچہ مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، مگر ان کی اور ان کی کتاب سنن کو اسی شہر کی نسبت سے شہرت حاصل ہوئی،

تعلیم کے لیے سفر | نسائی کی تعلیم خصوصاً ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملتے، مگر یہ مسلم ہے کہ اس زمانہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۸ [2] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۵۵۹ [3] کتاب الانساب و معجم البلدان

کے دستور اور دیگر ائمۂ سلف کی طرح امام نسائی نے بھی حصول علم کے لیے کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی اور اپنے زمانہ کے تمام مشہور اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث نبوی کا سماع کیا، اور جہاں کہیں علوم نبوت کا سرچشمہ دیکھا وہاں جاکر اس سے سیراب ہوئے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

رحل الی الآفاق واشتغل بسماع	دور دراز شہروں میں جاکر سماع حدیث میں
الحدیث والاجتماع بالائمۃ الحذاق	مصروف رہے اور ان ائمۂ فن اور مشائخ کبار
ومشائخ الذین روی عنهم مشافهة[1]	سے ملے جن سے بالمشافہ سنکر روایت کی ہے۔

سیوطی نے "جال فی البلاد" لکھکر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، تذکرہ وطبقات کی دوسری کتابوں میں حصول علم کی خاطر آپ کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان وغیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ امام نسائی نے سب سے پہلے نیشاپور کا سفر کیا اور وہاں اسحاق بن ابراہیم، حسین بن منصور اور محمد بن رافع جیسے اصحاب علم و فضل سے کسب فیض کیا، پھر بغداد گئے اور وہاں کے اجلہ علماء بالخصوص قتیبہ سے زیادہ استفادہ کیا، مرو میں بھی قیام کیا اور علی بن حجر وغیرہ سے فیضیاب ہوئے، پھر عراق میں ابو کریب جیسے ائمۂ فن سے حدیثیں لکھیں، اسی طرح شام، مصر اور الجزائر وغیرہ کا سفر بھی اختیار کیا،[2] اور ہر جگہ کے ارباب فضل و کمال سے استفادہ کرتے رہے، امام موصوف خود بیان کرتے ہیں کہ میں پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے گیا اور ایک سال دو ماہ وہاں ٹھہرا۔

اساتذہ اور شیوخ امام نسائی قدرت کی طرف سے علم کا ذوق و شوق لیکر آئے تھے، اس لیے وہ اپنے زمانہ کے تمام اہل کمال اور ائمۂ فن سے مستفیض ہوئے، اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد اتنی کثیر ہو کہ ان سب کا استقصاء دشوار ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ [2] المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ج ۶ ص ۱۳۱

سمع من خلائق لا یحصون یاتی	انھوں نے بے شمار لوگوں سے حدیثیں سنیں جن میں
اکثرهم فی هذا الکتاب[1]	اکثر کا ذکر اس کتاب میں ہوگا۔

حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کے بعض شیوخ کی تفصیل بیان کی ہے جن کے نام یہ ہیں:

قتیبہ بن سعید، اسحٰق بن راہویہ، ہشام بن عمار، عیسیٰ بن حماد، حسین بن منصور سلمی، عمرو بن زرارۃ، محمد بن نصر مروزی، سوید بن نصر، ابو کریب، محمد بن رافع، علی بن حجر، ابو یزید جرمی اور یونس بن عبد الاعلیٰ[2] وغیرہ جیسے افاضل اور اساطین علم حدیث سے خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام اور جزائر وغیرہ میں احادیث نبوی کا سماع کیا،

علامہ ابن حجر نے فن قرأت کی تحصیل کے سلسلہ میں آپ کے دو اور اساتذہ احمد بن نصر نیشاپوری اور ابو شعیب سوسی کا نام بیان کیا ہے،[3]

تلامذہ اساتذہ کی طرح تلامذہ اور شاگردوں کی بھی اتنی کثرت ہے کہ ان کے ناموں کا احاطہ کرنا دشوار ہے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو بشر دولابی، ابو علی حسین بن محمد نیشاپوری، ابو القاسم حمزۃ بن محمد کنانی، ابو علی حسن ابن خضر السیوطی، ابو بکر بن سنی، ابو القاسم طبرانی، محمد بن معاویۃ، حسن بن رشیق، ابو الحسن محمد بن عبد اللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابو بکر احمد بن محمد بن المہندس، ابو عوانۃ، ابو جعفر طحاوی ابو بکر احمد بن حداد، ابو جعفر عقیلی، ابو علی بن ہارون اور خود نسائی کے صاحبزادے عبد الکریم وغیرہ جیسے مشاہیر نے ان سے حدیث کا سماع کیا، ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنھوں نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے،[4]

علم حدیث میں امتیاز تیسری صدی ہجری کا زمانہ علم حدیث کے انتہائی عروج کا دور سمجھا جاتا ہے اس دور

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶ وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۸۳-۸۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ [4] الفتح ج ۱ ص ۳، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۷ وطبقات الشافعیۃ ج ۲ ص ۸۴

میں علم حدیث کا گھر گھر چرچا تھا، لوگ علم حدیث کی تحصیل کے لیے دور دراز کے ملکوں کا سفر اختیار کرتے تھے، ایسے زمانہ میں کوئی صاحب ذوق فن حدیث سے کس طرح بیگانہ اور بے بہرہ رہ سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے زیادہ نامور محدثین اور اساطین فن کسی زمانہ میں بھی نہیں پیدا ہوئے، اگرچہ متاخرین میں بھی کچھ اہل کمال پیدا ہوئے ہیں مگر انکی تعداد بہت کم ہے، اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسکے اکثر اہل علم اس فن میں پورا کمال رکھتے تھے اور مجموعی حیثیت سے انکی مثال بعد کے زمانہ میں نہ ملے گی،

اسلیے قدرتی طور پر امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو رسوخ اور تبحر حاصل ہوا وہ انکے دوسرے معاصرین کو میسر نہیں، امام نسائی کی مقبولیت اور شہرت کا اصلی سبب یہی کمال و امتیاز ہے اور علوم نبوت ہی کی خدمت کا فیض ہے کہ اجتک انکا نام زندہ ہے اور جبتک مسلمانوں میں علم دین کا ذوق باقی رہیگا امام نسائی اور انکی سنن کا نام زندہ رہیگا۔

علم حدیث میں کمال کے جو ذرائع ہو سکتے ہیں امام موصوف ان سب کا نمونہ تھے اور ان میں ایک بلند پایہ محدث کے جملہ اوصاف وخصائص موجود تھے، وہ ضبط وحفظ، ثقاہت وعدالت اور صدق وامانت وغیرہ کا پیکر تھے، جرح وتعدیل کے فن کے ماہر تھے، صحیح وسقیم اور قوی وضعیف روایات کی پوری پرکھ رکھتے تھے، ان کی تصنیفات علوم حدیث میں ان کے کمال اور علوے مرتبت پر شاہد ہیں،

اکابر علماے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حافظ ابو عبد الرحمٰن نسائی سے بڑھکر ان کے زمانہ میں احادیث ورجال کا کوئی عالم نہ تھا، مشہور محدث امام دارقطنی ارشاد فرماتے ہیں،

ابو عبد الرحمٰن النسائی مقدم علی	امام نسائی اپنے دور میں تمام علماے حدیث سے
کل من یذکر بھذا العلم من اہل	فائق وبرتر تھے، اور ان کی کتاب "صحیح" کے نام
عصرہ وکان یسمی کتابہ الصحیح[1]	سے موسوم کی جاتی ہے،

مشہور حافظ حدیث ابو علی حافظ کا بیان ہے:

للنسائی شرط فی الرجال اشد من شرط	رجال کے ضبط وثقاہت کے متعلق امام نسائی

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۲۳

مسلم بن الحجاج ...... ھو الامام	امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرائط رکھتے تھے.....
فی الحدیث بلا مدافعۃ[1]	اور وہ بلا شبہہ بغیر کسی حیلہ وحجت کے امام حدیث تھے،

ابن یونس صاحب تاریخ مصر لکھتے ہیں:

کان النسائی اماما فی الحدیث	نسائی حدیث میں امام، ثقہ، معتبر اور
ثقۃ ثبتا حافظا[2]	حافظ تھے،

امام دارقطنی لکھتے ہیں:

کان ابو بکر بن الحداد کثیر الحدیث	ابو بکر بن حداد باوجود کثیر الحدیث ہونے کے
ولم یرو عن احد سوی النسائی	نسائی کے علاوہ کسی سے روایت نہیں کرتے تھے،
وقال رضیت بہ حجۃ فیما بینی	اور کہتے تھے کہ میں نے اپنے اور خدا کے درمیان حجت
وبین اللہ عز وجل[3]	کے لیے انھیں منتخب کیا ہے،

دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک بیک زبان فرماتے ہیں:

کان افقہ مشائخ مصر فی عصرہ	نسائی اپنے دور میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ، صحیح
واعرفھم بالصحیح والسقیم من الآثار	وسقیم روایات کے سب سے زیادہ ماہر اور رجال
واعرفھم بالرجال[4]	کے سب سے بڑے واقف کار تھے،

علامہ ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا، انھوں نے اسکی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، انھوں نے یہ سنکر کہا

یا بنی ان لابی عبد الرحمٰن شرطا	صاحبزادے! ابو عبد الرحمٰن کی رجال کے بارے میں
فی الرجال اشد من شرط البخاری ومسلم[5]	امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں،

[1] تا [4] یہ اقوال عموماً اکثر اہل سیر وتذکرہ نے نقل کیا ہے، ہم نے ابن کثیر کی البدایۃ والنہایہ سے اسے جمع کیا ہے ملاحظہ ہو ج ۱۱ ص ۱۲۳

[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۸۴

حافظ ابو علی نیشاپوری کا ارشاد ہے کہ میں نے سفر و حضر میں چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے دو یعنی محمد بن اسحاق اور ابراہیم بن ابی طالب تو میرے وطن میں ہیں، تیسرے نسائی مصر میں اور چوتھے عبدان اہواز میں ہیں۔[1]

مامون مصری کہتے ہیں کہ جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث (عبد اللہ بن احمد مرتع اور ابو الاذان وغیرہ) مجتمع ہوئے تو سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھیں۔[2]

علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ حافظ ابو عبد اللہ ذہبی سے دریافت کیا کہ مسلم بن حجاج اور نسائی میں احفظ کون ہے، انھوں نے جواب میں فرمایا نسائی، ابن سبکی کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد ماجد سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی اس خیال کی تائید فرمائی۔[3]

غرض امام نسائی اپنے زمانہ میں علم حدیث کے بہت بڑے ماہر اور عالم تھے، وہ مختلف حیثیتوں سے دوسرے محدثین سے ممتاز، بلند پایہ اور منفرد حیثیت کے مالک تھے، ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور علم حدیث میں رفعت و امامت کے متعلق اہل علم کی بہت سی شہادتیں ہیں، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وکذلک اثنی علیہ غیر واحد من الائمۃ وشھد والہ بالفضل والتقدم فی ھذا الشان۔

دوسرے علوم سے تعلق

امام نسائی کا اصلی فن تو علم حدیث تھا اور اسی کی بدولت انھیں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس کے علاوہ بھی وہ دوسرے علوم دینیہ سے بیگانہ نہ تھے، فن قرأت و تفسیر کا حال اس سے پہلے گذر چکا ہے، فقہی اور استنباطی مسائل میں ان کو غیر معمولی نظر و بصیرت حاصل تھی، بلکہ علم حدیث ہی کی طرح ان کے زمانہ میں اس فن میں بھی ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے "کان افقہ مشائخ اھل مصر فی عصرہ" یعنی ابو عبد الرحمٰن نسائی اپنے زمانہ کے مشائخ مصر میں سب سے بڑے فقیہ تھے، علامہ ابن جوزی نے ابن یونس صاحب تاریخ مصر

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ [2] ایضاً [3] طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۲ ص ۸۴

کی اس تصریح "وکان اماما ثقۃ ثبتاً حافظاً" پر "فقیھا" کا بھی اضافہ کیا ہے۔[1] فقہ میں انکی غیر معمولی مہارت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھیں حمص میں قضا اور ولایت کا منصب تفویض کیا گیا اور خود ان کی سنن میں جابجا اختلافی مباحث اور فقہی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔

فقہ، حدیث اور تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم اسلامیہ میں بھی انھیں پورا کمال حاصل تھا۔

نسائی امام المسلمین تھے

فقہ و حدیث میں کامل بصیرت، علمی و دینی خدمات، زہد و تقویٰ اور دوسری گوناگوں فضیلتوں اور کمالات کے باعث وہ مسلمانوں کے امام اور مقتدا قرار پائے، ابن عدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد بن سلامۃ طحاوی کی زبان سے سنا ہے کہ "ابو عبد الرحمٰن امام من ائمۃ المسلمین"[2] یعنی ابو عبد الرحمٰن مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔

حافظ ابو الحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ میرے کانوں نے اپنے مصری مشائخ کی زبان سے نسائی کے فضل و مرتبت اور امامت و تقدم کا اعتراف سنا ہے۔[3]

محمد بن سعد باوردی کہتے ہیں کہ "میں نے قاسم مطرز سے نسائی کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا:

هو امام او یستحق ان یکون اماما[4] — وہ امام ہیں یا منصب امامت کے اہل اور مستحق ہیں

ابو علی نیشاپوری کا اعتراف ہے کہ

وکان من ائمۃ المسلمین[5] — وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے،

غرض نسائی اپنے اوصاف و کمالات کے اعتبار سے بڑی بلند پایہ شخصیت رکھتے تھے اور شیخ الاسلام اور امام المسلمین کہے جاتے تھے، چنانچہ علامہ سیوطی ان کو القاضی، الحافظ، شیخ الاسلام احد الائمۃ المبرزین والحفاظ المتقنین والاعلام المشہورین کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔[6]

زہد و تقویٰ اور کثرت عبادت

امام نسائی کی عملی زندگی بھی انتہائی پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز

[1] المنتظم ج ۶ ص ۱۳۱ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ [4] و [5] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ [6] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۵

قلب ذکر الٰہی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گذار، پابند شرع اور صاحب ورع و تقویٰ تھے، رات و دن کا بیشتر حصہ خدا کی عبادت اور ذکر و فکر میں گذارتے، تہجد کا خاص اہتمام و التزام رکھتے تھے، صوم داؤدی کے پابند تھے یعنی ایک دن افطار کرتے اور دوسرے دن روزہ رکھتے، حج بھی اکثر کرتے تھے اور جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے اور اپنی بے مثال شجاعت و بہادری اور فداکاری و جاں نثاری کا مظاہرہ کیا، ان کی بہادری و جاں نثاری دیکھکر لوگوں کو قرن اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی،

سنن اور معمولات نبویہ پر عمل کا خاص اہتمام تھا، رد بدعت اور احیاء سنت میں بڑے سرگرم تھے، غرض ان کی پوری زندگی سنت نبویہ پر عمل میں بسر ہوئی، ان کے کل اوقات عبادت و اطاعت الٰہی میں گذرتے تھے، اور ان تمام معمولات پر عمر بھر قائم رہے[1]،

صبر و استقلال صبر و رضا، ضبط و تحمل، شجاعت و بہادری اور عزم و استقلال کا پیکر تھے، ان کے صبر و ضبط کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب "خصائص علی" تصنیف کی اور لوگوں کے سامنے اسے سنایا تو انھوں نے حضرت امیر معاویہ کے فضائل و مناقب بھی بیان کرنے کا مطالبہ کیا لیکن امام نسائی نے اس سے انکار کیا، انکے انکار پر انھیں بڑی بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، مگر وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان شدائد کو انگیز کرتے رہے اور ان کے استقلال میں فرق نہ آیا، حافظ ذہبی احمد بن نصر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

من یصبر علی ما یصبر علیہ النسائی	امام نسائی کی طرح کون صبر کرسکتا ہے حالانکہ ان کے
عندہ حدیث ابن لهیعة ترجمة	پاس ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انھوں نے
ترجمة فما حدث بها وکان لا یری	اسے نہیں بیان کیا اور وہ ابن لہیعہ سے حدیث
ان یحدث بحدیث ابن لهیعة[2]	بیان کرنا مناسب نہیں خیال کرتے تھے،

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۸، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳
[2] تہذیب ج ۱ ص ۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸

حلیہ اور طرز معاشرت امام نسائی بڑے وجیہ و شکیل اور نہایت خوش خوراک و خوش پوشاک تھے، چہرہ اتنا بارونق اور پرنور تھا کہ معلوم ہوتا تھا شمع جل رہی ہے، رنگ نہایت سرخ و سفید تھا، بڑھاپے میں بھی حسن و رعنائی اور تروتازگی میں فرق نہ آیا تھا، لباس نہایت عمدہ استعمال کرتے، رنگین اور قیمتی لباس پہننے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، بہترین غذائیں کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے اور خوب فربہ کرکے کھاتے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے[1]، غرض ان کی معاشرت اور دنیاوی زندگی بھی بڑی پرشکوہ تھی،

خاندان امام صاحب کے خاندانی حالات کی تفصیل نہیں ملتی، مگر ان کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ رہے ہوں گے، صاحب شذرات کا بیان ہے:

وکان رئیسا نبیلا حسن البزۃ	وہ رئیس، نجیب و شریف، خوش وضع
کبیر القدر	اور عظیم المرتبت تھے،

بے نیازی ان کی طبیعت میں بڑا استغناء اور بڑی بے نیازی تھی، مزاج میں شاہانہ جاہ و جلال، وقار و تمکنت اور عزت نفس و خودداری تھی، شمس الدین ذہبی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار امیر مصر کے ساتھ کسی جنگ میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا تو سلطان کی مجلس سے دور ہی دور رہے، اور جنگ میں پوری شجاعت اور بہادری سے حصہ لیا،

ازواج و اولاد عام طور سے مورخین و اصحاب سیر نے حافظ ابن عساکر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نسائی کے چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں لیکن ان کے ناموں کی تفصیل اور اولاد وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ حافظ ابن حجر نے آپ کے تلامذہ کے تذکرہ میں آپ کے ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام لیا ہے،

[1] ان تفصیلات کے لیے تذکرۃ الحفاظ، شذرات الذہب اور البدایہ والنہایہ ملاحظہ ہو،

فقہی مسلک | امام نسائی فقہ کے مذاہب اربعہ کے بعد پیدا ہوئے ہیں، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس فقہی مذہب سے وابستہ تھے، عام طور سے تذکرہ نویسوں اور ان کے سوانح نگاروں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ عام محدثین کی طرح کسی فقہی مسلک سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ جزئیات مسائل میں احادیث نبوی پر عمل کرتے رہے ہوں گے، اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب پاتے تھے ان کی توثیق فرماتے تھے، لیکن ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں شافعی المذہب سمجھتے تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی فرماتے ہیں:

او شافعی المذہب بود چنانچہ مناسک او بر آں دلالت میکند[1]

اسی طرح نواب صدیق حسن خانصاحب نے "الحطہ" میں انھیں شافعی المذہب لکھا ہے،

تصنیفات | امام نسائی کی چند ہی تصنیفات کا عام طور سے تذکرہ ملتا ہے، ذیل میں انکی تفصیل بیان کیجاتی ہے:

سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ۔ آگے چل کر ہم ان کا مفصل تعارف کرائیں گے، اور بالخصوص صغریٰ پر شرح وبسط کے ساتھ تبصرہ کریں گے اور اس کی خصوصیات بھی واضح کریں گے۔

خصائص سیدنا علیؓ۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو امیر المومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب کے فضائل ومناقب پر مشتمل ہے، اس میں متعدد آثار واحادیث کی بنیاد پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے محاسن، دربار رسالت میں رسوخ اور دیگر اہل بیت کے فضائل وکمالات کی وضاحت فرمائی ہے، اس کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی بدولت ہدایت سے سرفراز کرے،"[2] لیکن لوگوں نے بدبختی سے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا اور اس کی سزا میں امام حدیث کو زد وکوب کیا اور مسجد تک سے باہر نکال دیا۔

---

[1] بستان المحدثین ص ۱۱۱ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۶

مسند علی ومسند مالک۔ یہ دونوں کتابیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، حضرت علیؓ اور امام مالکؒ کے مسانید پر مشتمل ہوں گی، لیکن غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں، اس لیے ان کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کیجاسکتی، صاحب کشف الظنون وغیرہ نے بھی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے۔

کتاب الضعفاء والمتروکین۔ امام صاحب کے سوانح نگاروں نے ان ہی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے علاوہ امام نسائی کی ایک اور مختصر تالیف "کتاب الضعفاء والمتروکین" ہے، جو طبع ہو چکی ہے، اس کے ساتھ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر بھی شامل ہے، مگر حیرت ہے کہ اصحاب سیر وتذکرہ اس کا ذکر نہیں کرتے، معجم المطبوعات میں اس کے متعلق نہایت اجمال کے ساتھ لکھا ہے:

الضعفاء والمتروکین (فی رواۃ	ضعفاء اور متروکین فن رجال کی کتاب ہے جو
الحدیث) طبع مع کتاب المنفردات	۱۳۲۳ھ میں امام بخاری کی کتاب المنفردات
والوحدان للامام البخاری (ہند ۱۳۲۳)[1]	والوحدان کیساتھ ہندستان میں شائع ہوئی ہے

اس رسالہ میں ضعیف اور متروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے ذکر کیا گیا ہے، یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہایت اہم اور مفید ہے،

کتاب الجمعہ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے آپ کے اس رسالہ کا ذکر کیا ہے، مگر اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے،

ایک جدید مصری عالم محمد عبدالعزیز خولی نے فن جرح وتعدیل میں آپ کی ایک کتاب التمییز کا ذکر کیا ہے[2]، اور کتب مدلسین کے سلسلہ میں آپ کی ایک اور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۸۵۲ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۵۲

اول من افرد المدلسین بالتصنیف الامام حسین بن علی الکرابیسی (۲۴۸) صاحب الشافعی ثم صنف فیه النسائی[1]	سب سے پہلے مدلسین کے متعلق امام حسین ابن علی کرابیسی شافعی (متوفی ۲۴۸ھ) نے مستقل کتاب لکھی، پھر اس کے بعد امام نسائی نے۔

ان کتابوں کے علاوہ بظاہر امام صاحب کی اور کوئی کتاب موجود نہیں معلوم ہوتی، مگر قیاس ہے کہ "خصائص علی" کی طرح مناقب صحابہ میں بھی ان کی کوئی تالیف ضرور رہی ہوگی اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جب خصائص علی تحریر کی تو لوگوں نے پوچھا کہ "آپ نے شیخین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب کے فضائل کیوں نہیں لکھے۔" انھوں نے جواب دیا کہ "میں جب دمشق آیا تو دیکھا کہ لوگ حضرت علیؓ کے معاملہ میں نواصب کی کیفیت اختیار کر چکے تھے، تو یہ کتاب تالیف کی تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی بدولت ہدایت بخشے۔" علامہ ابن سبکی اس کا تذکرہ کرنے کے بعد بعد ہی لکھتے ہیں:

ثم صنف بعد ذالک فضائل الصحابة رضی اللہ عنهم[2]	پھر اس کے بعد فضائل صحابہ رضی اللہ عنہ تالیف کیے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ثم صنف بعد ذالک کتاب فضائل الصحابة وقرأها علی الناس[3]	پھر خصائص کے بعد فضائل صحابہ میں کتاب لکھی اور لوگوں کے سامنے اسے پڑھا

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

ثم انه صنف بعد ذلک فضائل الصحابة[4]	نسائی نے خصائص علی کے بعد فضائل صحابہ پر بھی تصنیف کی

۲۶۸

[1] مفتاح السنة ص ۱۵۳ [2] طبقات جلد ۲ ص ۸۴ [3] تہذیب ج ۱ ص ۳۸ [4] تذکرۃ الحفاظ ۲۴

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام نسائی نے فضائل صحابہ میں کوئی کتاب لکھی تھی، قیاس ہے کہ ان کے علاوہ بھی امام نسائی کی دوسری تصنیفات ہوں گی جو اب ناپید ہو گئیں، علامہ خیر الدین زرکلی آپ کی تصنیفات کے ذکر میں لکھتے ہیں:

له "السنن الکبری" و "السنن الصغری" فی الحدیث والصغری من الکتب الستة وله "خصائص علی" و "مسند علی" و "مسند مالک" وغیر ذلک[1]	سنن کبری اور سنن صغری فن حدیث میں امام نسائی کی کتابیں ہیں اور صغری صحاح ستہ میں شامل ہے اور ان کی تصنیفات میں خصائص علی، مسند علی اور مسند مالک وغیرہ ہیں،

صاحب اعلام کے "وغیر ذلک" کے فقرے سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی دوسری تصنیفات یا تو اہل فکر و نظر سے مخفی رہیں یا انکی اہمیت مذکورۂ بالا کتابوں کی طرح نہیں تھی، اس لیے انھوں نے انکا ذکر نہیں کیا، اسلیے آج ان کا نام بھی نہیں معلوم۔ واللہ اعلم

وفات | امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنی ضربات پہنچی تھیں کہ اسی صدمہ سے ۳۰۳ھ میں انکا انتقال ہو گیا، اتنا مسلم ہے کہ ان کی وفات اسی سے ہوئی، لیکن اس تفصیل میں روایات مختلف ہیں، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے رفقاء سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، ابن خلکان، حافظ ذہبی، ابن جوزی، ابن حجر اور ابن سبکی کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہو گئی اور وہیں دفن کیے گئے، ابن کثیر نے ایک قول نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گئے، لیکن ابن کثیر، دارقطنی، سیوطی، ابن عماد ابو یونس وغیرہ کا بیان ہے کہ مکہ میں وفات پائی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن ہوئے، سنہ وفات ۳۰۳ھ مسلم ہے، مگر بعض کے نزدیک شعبان اور بعض کے نزدیک صفر میں وفات پائی، انتقال کے وقت ۸۸ سال کی عمر تھی،

(باقی)

[1] اعلام

جدید عربی ادب کے چند پہلو

ڈاکٹر عبدالکریم جرمانس

ترجمہ مولوی محمود الحسن صاحب ندوی

(۲)

اس کے بعد ڈرامائی شاعری کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا، دراصل ڈرامائی ادب عربی میں بالکل نئی چیز ہے، اس صنف میں ابتدائی کوششیں خالص قومی نقطۂ نظر سے کی گئیں اور قومی جذبات کو ابھارنے کے لیے اسلاف کی عظمت کے واقعات پیش کیے گئے، اس بارہ میں کہ اسٹیج پر منظوم ڈرامے کے ذریعہ خیالات ظاہر کیے جاسکتے ہیں یا نہیں، لوگوں کا اختلاف ہے،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عزیز اباظہ کے منظوم ڈرامہ غروب الاندلس کے دیباچہ میں لکھا ہے "منظوم ڈرامہ اپنی ابتدائی عمر سے آگے نہیں بڑھ سکا اور یہ صنف مواد اور نظم دونوں کو سخت نقصان پہنچاتی ہے، اسٹیج پر نثر ہی قابل ترجیح ہے"۔ اس کے برعکس عزیز اباظہ کی رائے یہ ہے کہ "عوام کے لیے منظوم ڈرامہ ہی زیادہ دلچسپ ہوتا، جیسا کہ مغربی اسٹیج کے ڈراموں کی کامیابی سے ظاہر ہے"، احمد شوقی نے پہلی مرتبہ عربی ادب کو منظوم ڈرامے سے روشناس کرایا اور مغربی شعراء کی تقلید کے چند نمونے پیش کیے، چونکہ وہ غیر معمولی ذہین اور عربی شاعری کی روایات سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لیے ڈرامائی نظموں میں انھوں نے ان شاندار روایات کو پوری طرح برتا، ایک زمانے میں یہ خیال تھا کہ عربی شاعری کی تنگ اس صنف کے لیے بہت موزوں ثابت ہوگی، مگر یہ خیال صرف شوقی کی حد تک تو صحیح ہوسکتا ہے،

اس کے بعد منظوم ڈرامہ نگاری پر زوال آگیا، اور ڈرامہ نگار پھر نثر کی طرف واپس آگئے،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے ایک مضمون میں عزیز اباظہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے "ڈرامائی ادب پہلی جنگ عظیم کے بعد وجود میں آیا، اس نے شوقی کو بالکل بدل دیا، اب وہ درباری شاعر نہیں بلکہ عوام کا ہمنوا بن گیا اور اس کے اثرات نے شوقی کو نیا ادبی طرز اپنانے پر مجبور کیا، اس نئے نظریہ نے اسکے اندر خود شناسی اور قومی شعور کے احساسات پیدا کیے اور اس نے مغربی ڈرامہ نگاروں سے ہمسری کی کوشش کی"۔

یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ شوقی شاعر پہلے سے تھا، اور ڈرامہ نگار بعد میں بنا، یہی وجہ ہے کہ وہ اس صنف میں کامیاب نہ ہوسکا، اس کے ڈرامے مترنم ہیں، اور اس کے مکالمے اس خوبی کی بنا پر بہت پسند کیے گئے اور گویوں نے انھیں گا کر بام شہرت پر پہنچا دیا،

عراق چونکہ دنیا کے معاشی محور سے بہت دور ہے، اس لیے وہ اپنی پرانی اور فرسودہ روایات کو قائم رکھنے میں بہت حد تک کامیاب رہا، عراق کے متعدد شاعروں میں جنھیں انائیل نے اپنی کتاب "الادب العصری" میں پیش کیا ہے، ممتاز شخصیت "جمیل صادق الزہاوی" کی ہے، زہاوی کے چہرے سے اسلامی مشرق کے پرجوش نیک نیت اور فلسفی شاعر کی خصوصیات آشکارا ہوتی ہیں، اس کے لمبے لمبے پریشان بال، بے ترتیب داڑھی اور بے رونق آنکھیں مشرق کے پریشان ماحول کی غمازی کرتی ہیں، زہاوی جسمانی طور پر بہت ہی کمزور تھا، وہ مشکل سے اپنے پاؤں ہلا سکتا تھا، بغداد کے قہوہ خانوں میں سفید خچر پر سوار ہوکر جایا کرتا تھا، اور وہیں اپنے فرصت کے اوقات مختلف تفریحوں میں گذارتا اور نظمیں لکھتا تھا، اس نے متعدد سائنٹفک رسالے بھی لکھے ہیں، ان رسالوں میں زہاوی نے تخلیقِ کائنات اور اس کے عمل کو قانون کشش کے بجائے الیکٹرون کے ردعمل کی جانب منسوب کیا ہے۔ ان سائنٹفک نظریات کے علاوہ اس نے متعدد نظمیں لکھی ہیں، حلیم مصری اپنی مذکورہ بالا کتاب میں زہاوی کو عربی شاعری کا مجدد تسلیم کرتا ہے، ٹھنڈے دماغ اور سنجیدہ فکر کے انسان اپنی جذباتی رو کو جذب کرلیتے ہیں،

تاہم اس کے اشعار میں تخیل کی کمی نہیں ملتی،

زہاوی کی شاعری Wonds wasth اور Pale Uelesy سے ملتی جلتی ہے،
زندگی کے مسائل نے اس میں دلچسپی کی روح پھونکی اور قلم کو اس کے اظہار پر آمادہ کیا، ڈارون کے
نظریۂ ارتقاء پر اس کی نظم کے بعض اشعار یہ ہیں:

عاش فی الغاب القرد دهرا طویلا — قبل ان یلقی للرقی سبیلا
ولد القرد قبل ملیون عام — بشراً فارتقی قلیلاً قلیلا
ای شیٔ اله با القرد حتی — هجرا لغاب نجله والقبیلا
انه لولا العقل لکان ضعیفا — وعلیه الحیاة عبئا ثقیلا
وعلی رجلیه مشی بعد ان سا — ر علی اربع زمانا طویلا
اتخذ الحجر بعد نحت سلاحا — یتقی الوحش ضاریا ان یغولا
ان عقل الانسان خیر سلاح — ولقد تفضل العقول العقولا
یا له من تطور حول القرد — الانسان یحسن التخییلا

ترقی کا راستہ ملنے سے پہلے بندر نے صدیوں تک جنگل میں زندگی کے ایام گذارے،
لاکھوں برس پہلے بندر سے آدمی وجود میں آیا، آہستہ آہستہ اس نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں
اس میں کونسی تبدیلی ہوئی جس کی وجہ سے وہ اپنے صحرائی وطن، اولاد و خاندان سے جدا ہو گیا،
اس کے عقل نہ آتی تو بہت کمزور رہتا، اس کی زندگی مہمل اور بڑی بوجھل ہوتی، اپنے چاروں
پیروں سے وہ صدیوں چلتا رہا، پھر دو پیروں سے چلنے لگا، اس نے پتھروں کو گڑھ کر ہتھیار بنائے
تاکہ حملہ آور جانوروں سے اپنی حفاظت کر سکے، انسان کا بہترین ہتھیار اس کی عقل ہے، وہ عقل
جو تمام دوسری عقلوں سے بازی لے گئی، بندر کے انسان بننے میں کسی زبردست تبدیلی اور اس کا
تخیل کتنا حسین ہے۔

یہ عقلی انداز ہے اعتزال پسندوں اور اخوان الصفاء کے مفکرین سے مختلف نہیں کہا جا سکتا، وہ اپنی
اس طویل نظم کو ان اشعار پر ختم کرتا ہے ؎

کل ظنی ان الحیاة علی الارض — بدت من تفاعل الکیمیاء
وهی لیست فی کل ذالک الا — مظهرا من مظاهر الکهرباء
ولد الکهرباء فی الارض احیاء — بدت قبل البر والدأماء
ثم ان الحیوان بعد دهور — صار انسانا ماشیا باستواء
وقضت سنة الوراثة فیه — ان تکون الابناء کالآباء

میرا گمان ہے کہ روئے زمین پر زندگی کیمیاوی ردعمل سے وجود میں آئی، اس کی حقیقت
اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ کہربا کا مظہر ہے، زمین و سمندر کی پیدائش سے پہلے اس قوت نے
زمین میں زندگی پیدا کر دی تھی، پھر ایک طویل زمانہ کے بعد جانور سیدھا چلنے پھرنے والا انسان
بن گیا، قانون وراثت کا یہ فیصلہ ہے کہ آباء و اجداد کی طرح اس کی نسلیں بھی ہوں،

زہاوی کی عقلیت خالص مشرقی اور خود اس کے اپنے وجدان کا نتیجہ ہے، جب کبھی اس پر
تشکیک غالب آتی ہے تو کہتا ہے ؎

حیرة فی الحیوة قد صدفتنی — عن بلوغی من الحیوة مرامی
وقفت انی الطیل وقوفا — فی ممر الشکوک والاوهام

رازِ حیات کے تحیر سے زندگی کے مقصد تک میری رسائی نہیں ہوئی، میں شکوک و
اوہام کی راہوں میں مدتوں پڑا رہا ہوں"

خفاجی نے زہاوی کے مندرجۂ ذیل اشعار میں ابو العلاء المعری کے اثرات کیجانب اشارہ کیا ہے، [1]

---

[1] یہ اشعار اسلیے نقل کیے گئے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آزادی خیال اور الحاد و بے دینی کی وبا کہاں تک پہنچ چکی ہے اور عربی کی
جدید شاعری کس راہ پر جا رہی ہے ؎ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ٭ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

وان اکبر شئ فیک یعجبنی سخریۃ بتقالید وعصیان
وانکروا فیک الحادا وزندقۃ وعلی ما انکروہ فیک بھتان
انی تلمذت فی مبنی علیک وان ابلت عظامک ازمان وازمان
اصابنی فی زمانی ما اصابک من حیف فما ردہ الحیف انسان

تیری سب سے بڑی خوبی جو مجھے پسند آئی وہ تیری طبیعت کی بغاوت اور قدیم روایات کا تمسخر و استہزاء ہے، تجھے لوگوں نے ملحد زندیق کہا اور بہتان کے طومار باندھ دیے، میں نے تیری شاگردی اختیار کی، اگرچہ تیری ہڈیوں کو مرور ایام نے گلا دیا، میرے حصہ میں وہی ظلم وجور آیا جو تجھ کو ملا تھا، اور جس کو کسی انسان نے نہیں روکا۔

زہاوی کو ان آزادانہ خیالات کے نتائج سے بھی دوچار ہونا پڑا اور بغداد کے دیندار طبقہ نے اس پر اعتراضات کی بوچھار کر دی جس کا جواب اس نے اپنی کتاب "مجز الصادق" میں دیا ہے،

زہاوی نے غنائیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جس سے اس کے جذبات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے مندرجۂ ذیل اشعار میں ایک خیالی محبوبہ کو مخاطب کیا ہے ؎

ابیت فی الدار وحدی معاتبا لخیالک
قد غرنی انہ کا ن باسما کمثالک
لا تسألینی عما اصابنی بعد ذالک
ما زلت اضمر حبا مناسبا لجمالک
ابیع کل حیاتی بساعۃ من وصالک
انی بحبک یا لیلی لا محالۃ هالک
فهل ساخطر یوما اذ هلکت ببالک

میں تیرے تصور میں تنہا گھر میں سوتا ہوں، اس چہرہ نے مجھے دھوکا دیا، کیونکہ وہ تیری طرح مسکرا رہا تھا، اس کے بعد مجھ پر کیا گذر گئی یہ نہ پوچھ، میں برابر تیرے جمال کے شایان شان تیری محبت کرتا رہا، تیری وصال کے ایک لمحہ کے عوض پوری زندگی بیچ دوں گا، اے لیلی تیری محبت میں ضرور ہلاک ہو جاؤں گا، کیا میرے مرنے کے بعد کبھی تیرے دل میں میرا خیال آئیگا،

زہاوی کے احساسات اتنے بے تکلف ہیں کہ اس کا اسٹائل گیتوں کے اسٹائل سے مل گیا ہے، شوقی نے اپنی کتاب میں زہاوی کی شاعری پر بڑی پرزور تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے "اس کی شاعری بہت زیادہ سائنٹفک ہے اور سائنس بہت زیادہ شاعرانہ ہے، وہ زندگی کے حسن سے نہ تو حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکتا ہے، اور نہ اس کے قبح پر آنسو ہی بہا سکتا ہے"،

اس کے برعکس خفاجی لکھتا ہے کہ "زہاوی لطیف جذبات کا شاعر ہے، اس نے قنوطیت سے دامن بچا کر المعری کی تقلید کی ہے، وہ رجائیت پسند انیسویں صدی کی آغوش میں پروان چڑھا تھا جس میں انسان عقل اور عقلیت پر زیادہ بھروسہ رکھتا تھا، اس نے اپنی رزمیہ نظم میں المعری کی بہت تعریف کی ہے، زہاوی کے وطن پرستانہ جذبات اس کی نظم "اننا فی الرجال غیور القلم" میں بڑے شد ومد سے ملتے ہیں،

اب میں عراق سے نکل کر دوسرے ملک میں داخل ہوتا ہوں، یہ ملک اگرچہ تاریخی روایات سے مالا مال نہیں ہے، پھر بھی خوشحال مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھا رہا ہے، سوڈان حال ہی میں گمنامی کا پردہ چاک کر کے ابھرا ہے، اور سیاسی کشمکش کی بنا پر اس منطقہ حارہ کی جانب لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگی ہیں،

ایک جواں مرگ شاعر اپنے وطن پرستانہ جذبات کو بڑے پرزور طریقے سے مصر کے سامنے پیش کرتا ہے، التیجانی بشیر کی نظمیں ابھی کتابی شکل میں نہیں آئی ہیں، اور صرف رسالوں واخبارات

کے صفحات میں منتشر ہیں، امید ہے کہ آنے والی نسل ان نظموں کو اکٹھا کرکے شائع کرے گی، یہ شاعر سوڈان اور مصر میں نظری اتحاد کا قائل تھا، چنانچہ کہتا ہے:

افلسنا الاخی هوی جمیعنا — سرحة الفکر فی اواصر کبری
مصر واشت وثقفت والمدت — منه شمسا واطلعت فیه بدرا
کیف یا قومنا نباعد من فکر — ین شدا وساندا لبعض ازرا
کیف قولوا بجانب النیل شطیعه — ویجری علی شواطی اخری
کلما انکروا ثقافة مصر — کنت من صنعها ابراعا و فکر

کیا ہم سب بھائی بھائی نہیں جنھیں وحدت خیال کے مضبوط رشتے نے آپس میں مربوط کر دیا ہے، مصر سرسبز و شاداب اور مہذب ہوا، اور اس کی سرزمین پر چاند اور سورج طلوع ہوئے، اے میری قوم ہم ان دونوں نظریات سے کیسے دست بردار ہو سکتے ہیں، یہ نظریات ایک دوسرے کا سہارا ہیں، لوگ کیسے کہتے ہیں کہ نیل اپنی صدیوں کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف بہنے لگے گی، جب بھی میرے اصل وطن نے مصر کی ثقافت کا انکار کیا میں نے اپنے خیالات اس کی دین تسلیم کیے۔

التیجانی بشیر نے اپنے وطن پرستانہ جذبات کا اظہار اپنی ایک مشہور نظم "وحی المحمد" میں کیا ہے، سید اسماعیل الازہری کی حج سے واپسی پر یہ نظم کہی گئی تھی، ایک اور نظم "مدینۃ الشعر والجمال" میں نہایت حسین و تخیلی انداز میں خرطوم کی تعریف کی ہے، ایک اور نظم "انوار القلب" میں سوڈان کے موسم بہار کا منظر بہت خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے، جگہ کی قلت اس کی مثالیں پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

میرے لائق دوست ذکی ابو شادی کی صاحبزادی نے خاص طور پر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا ہے،

ان کی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر چند سطریں ان کے متعلق لکھنا ضروری ہیں، پیشہ ور ڈاکٹر اور ماہر جرثومیات ابو شادی نے یورپین بیوی کی مدد سے اپنے گھر میں اپنی ایک دنیا بنا لی تھی، انھوں نے شکسپیر کے ڈرامے عربی میں منتقل کیے، اور انگریزی شاعری کی آزادی و تازگی دونوں کو اس میں برقرار رکھا، انھوں نے بے لچک عربی شاعری کو زندہ اور صداقت سے معمور شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جس کی مخالفت بھی اسی شدومد سے ہوئی مگر انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ سماجی بہبود تک وسیع کر دیا اور زرعی اصلاحات کے لیے کوشش کی، خطابات کے غلط استعمال پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اس کوشش کی سزا میں انھیں بڑی تکلیفیں پہنچائی گئیں، اتفاق سے ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا، بیوی کی موت سے اپنے وطن مصر میں تنہائی محسوس ہوئی، اور وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا، ان کی تصنیفات کچھ چھپ چکی ہیں اور بعض کے مسودے محفوظ ہیں، ان کے کارنامے جس طرح ان کی زندگی میں اختلاف کا سبب رہے آیندہ بھی بحث و مباحثہ کا موضوع بنیں گے۔

ان کی صاحبزادی صوفیہ نے اپنے والد کے اثر سے امریکن احول سے متاثر ہو کر آزاد شاعری کی طرف توجہ کی، اس کا دیوان ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے، جس سے اس کے تخیل اور اس کی حریت پسند روح کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے قصیدوں میں مشرق و مغرب کا خوشگوار امتزاج ہے، اور اس کی تمام نظمیں مقفیٰ نثر کا نمونہ ہیں، شاعری کا یہ اسلوب جبران اور میا زیادہ نے بھی اپنایا تھا، اس کی بنیاد سیدھے سادھے خیالات پر ہے، اس میں تخیل اور جذبات کا بھی امتزاج ہے، اور وہ ایک طرح کا منطقی نغمہ ہے، جو قافیہ اور عروض کی قیدوں سے آزاد ہے،

عرب تنقید نگار شاعری کی اس صنف کے بارے میں مختلف الخیال ہیں، کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ شاعری الفاظ کی صنعت کاری کا نام ہے، وہ الفاظ جو تخیل کے بازووں پر ابھرتے اور ہمارے احساسات و خیالات میں گہرائی پیدا کرتے ہیں، وہ اس نقطۂ نظر کی حمایت میں اسلامی شاعر

حضرت حسانؓ بن ثابت کا یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ ایک بار ان کے صاحبزادے نے نیش کی تعریف کی، باپ نے حیرانی اور پسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا "بیشک یہی شاعر ہے"، اور بشار ابن برد کا یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ اس کی نصیحت آمیز تقریر سن کر حاضرین پکار اٹھے "بیشک تمھاری نثر نظم سے زیادہ شاعرانہ ہے"۔

مگر دوسرے نقادوں کی رائے اس سے مختلف ہے، ان کا خیال ہے کہ شاعری میں عروض وہیئت ضروری ہے، ان دونوں کے بغیر جو شاعری ہوگی وہ ناکام ہوگی، صوفیہ کی نظمیں اگرچہ ہیئت کی پابند نہیں ہیں پھر بھی ان میں احساس کی گہرائی پائی جاتی ہے، اس کی نظم یاس

اقضی الایام تائھۃ فی بیداء　　میں اپنے ایام حیات تاریکی کے صحراؤں میں
من الظلام ..... والطرقات　　سراسیمگی کے ساتھ گذارتی ہوں راستے گھلے
المتضاربۃ کلھا المشاب شائکۃ　　ملے ہیں، ہر طرف خار دار جھاڑیاں ہیں، میں نے
فاذا حسبت الامل امامی یومی عنی　　گمان کیا کہ امید سامنے کھڑی میری طرف
الی وجدتہ السراب لقاسی یخد　　اشارہ کر رہی ہے، تو وہ سراب نکلا،

اپنے قصیدوں "الزورق الصغیر" اور "وسط المحیط" میں اس کشمکش کو نظم کیا جس سے زندگی میں ان کو واسطہ پڑا "فی عینک الدموع" میں گہرے جذبات کی پر درد صدائیں سنائی دیتی ہیں، اس کے دیوان میں مزاحیہ اشعار بھی ملتے ہیں، الزیاتی ([illegible]) اشعار بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں جنھیں زندگی کے سنجیدہ مسائل تخیل کے لباس میں بیان کیے گئے ہیں، غرض صوفیہ جدید عربی شاعری کا ہونہار نمونہ ہے،

آیئے سمندر پار کر کے پھر مصر آئیں جو پوری ایک صدی سے عربی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہے، جدید مصنفین کی وسیع جماعت میں عبدالغنی حسن کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے، اس نے ابن الرومی

پر ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے، خود بھی غیر معمولی شاعر ہے، اس کی وہ تمام نظمیں جو ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۵۴ء کے اثناء میں لکھی گئیں، حال ہی میں کتابی شکل میں "ناض من العمر" کے نام سے شائع ہوئی ہیں یہ دیوان ان پر جوش اور ولولہ انگیز اشعار سے شروع ہوتا ہے، خفاجی نے ان اشعار کا مقابلہ بحتری اور شریف مرتضیٰ کے ابیات سے کیا ہے ؎

من ھولاء الصامتون بغیرکم　　من ھولاء المجھون تقدموا
ما بالکم تقضی الامور بغیرکم　　ویکون دونکم القضاء یبرم
وتکاد کف الطامعین تصیبکم　　وتنال ما فرجوا المطامع منکم
الغانمون الارض بعد محمد　　اضحوا وفی کل ارض مغنم

یہ خاموش لوگ کون ہیں، بولو آواز دو، اے جھجکنے والو آگے بڑھو، تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تمھارے معاملات کا تصفیہ تمھاری مرضی کے بغیر کیا جاتا ہے، حریصوں کے ہاتھ تم تک پہنچنے والے ہیں، اور ان کی حرص و طمع پوری ہونے والی ہے، محمد علی کے بعد لیڈروں کا تسلط ہوگیا اور انھیں ہر جگہ لوٹ کھسوٹ کا موقع مل گیا۔

اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ غنی حسن انقلابی شاعر ہے اور موجودہ مصری سماج کی سستی ترقی سے غیر مطمئن ہے، وہ بڑی دلیری سے للکارتا ہے،

یا ایھا الاحرار فی خطواتکم　　نغم من الصوت القوی الخالد
ھو صوت کل مکافح عن حقہ　　بین الحتوف وصوت کل مجاھد
ھو صوت احرار الرجال اذا مشوا　　للغایۃ الکبری بقلب واحد
ھو صوت کل منافح متحرر　　من ربقۃ الرق القدیم البائد

اے حریت پسندو! تمھارے قدموں کے نیچے قوت وابدیت کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، یہ

آواز ہر اس مرد مجاہد کی ہے جو اپنے حق کے لیے ہلاکت کے موقعوں پر لڑنے والا ہے، یہ آواز ان حریت پسندوں کی ہے جو ایک مقصد عظیم کے لیے یکجان و متحد ہو کر جدوجہد کرتے ہیں، یہ ان احرار کی صدائیں ہیں جو غلامی کے فرسودہ اور قدیم بندھنوں کو توڑنے لگے ہیں۔

غنی حسن کی ایک کتاب ابھی شائع ہوئی ہے، جس میں انھوں نے متعدد تارکین وطن شاعروں کی تخلیقات بھی شامل کی ہیں، عزیز اباز انے اس کتاب کے دیباچہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی "تارک وطن شاعر نے ڈرامائی نظم میں اضافہ نہیں کیا، لیکن میرے نزدیک یہ رائے کسی حد تک غیر منصفانہ ہے، اباز انے اس ماحول کو نظر انداز کر دیا ہے جس میں ان شعرا کو رہنا پڑا، وہ مغربی زندگی کی اس نئی تشکل کے عادی نہیں تھے، ان کی شاعری میں یاد وطن کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اب بھی جذباتی طور پر اپنے آبائی وطن سے وابستہ تھے، جہاں تک ڈرامائی شاعری کا تعلق ہے ذکی ابو شادی نے امریکہ میں متعدد ڈرامے نظم میں لکھے ہیں، ان میں ابن زیدون، امرأ القیس اور کلوپٹرا وغیرہ تاریخی ڈرامے قابل ذکر ہیں، ان کا آخری شاندار ڈرامہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، ایک اور ڈرامہ "من نافذة التاریخ" المقتطف میں شائع ہوا تھا، وہ بھی مکمل نہیں، اس کا آخری ایکٹ غیر مطبوعہ ہے، جو آجکل "وادی فلسطین" کے قبضہ میں ہے، اس میں شاعر نے انسانیت کی تاریخ ڈرامائی انداز میں پیش کی ہے، اور انسان کا المیہ خاص طور پر بہت موثر ہے۔

غنی حسن نے اپنی کتاب میں جن تارک الوطن شاعروں کا ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں: علیا ابو ماضی، جبران، الیاس فرحت، میخائیل نعیمہ، شکر اللہ، شفیق المالوف، رشید ایوب، الیاس قنسول، فوضی المالوف وغیرہ متعدد امریکن عرب شاعروں نے علاماتی نظمیں بھی لکھی ہیں، ان میں ابو شادی، ناصدب اریدا، رشید ایوب، عبد المسیح حداد، علیا ابو الماضی قابل ذکر ہیں، یہ تمام شعرا انجمن رابطہ نیویارک سے تعلق رکھتے ہیں، شبل المالوف اور رشید الخوری الشاعر القروی کے قلمی نام سے شمالی امریکہ میں

لکھتے ہیں، انھوں نے ۱۹۲۲ء میں عصبۃ الاندلسی کے نام سے ادبی انجمن بھی قائم کی تھی۔

آخر میں چند سطریں حجاز اور کویت کے ادب پر بھی لکھی جاتی ہیں، کچھ سال پہلے یہاں کوئی ایسی ادبی تخلیق نہیں ہوئی تھی جسے خاص اہمیت دیجائے، میں نے ایک مضمون میں جو اسلامک ریویو میں شائع ہوا تھا، اس پر تبصرہ کیا تھا، اس دور میں ضرور ایک حد تک تھوڑی بہت شاعری موجود تھی، لیکن صرف گنے چنے اسکول کے اساتذہ اور سرکاری ملازمین اس کے شائق تھے۔

جب سے بین الاقوامی آمد و رفت نے سعودی عربیہ کو اپنے حلقہ میں شامل کیا ہے اور دوسرے ملکوں سے ثقافتی تعلقات کے دروازے کھلے ہیں اس وقت سے نئے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور جدید سماجی مسائل کا مقابلہ کرنے اور قومی پستی کو زور قلم سے سدھارنے کی جدوجہد کا آغاز ہوا ہے، اور نئے شعرا، میں عبد اللہ، عبد الجبار، ابراہیم حسن غلالی، سید الاموودی اور محمد حسن عواد قابل ذکر ہیں، عبد اللہ عبد الجبار نے ناولیں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں، یہ جدید ادبی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس کا ثبوت ان کے ڈرامے "امی" سے ہوتا ہے، انھوں نے ابراہیم الغلالیلی کی تنقیدی کتاب "المرصد" کا تتمہ بھی لکھا ہے، ان کا دلچسپ ترین ڈرامہ "الشیاطین الخرس" ہے جو تعمیری مقصد رکھتا ہے، اس ڈرامے کے کردار انفرادی نوعیت کے حامل ہیں، کچھ قدامت پرستانہ نقطۂ نظر کی نمایندگی بھی کرتے ہیں اور کچھ ترقی پسند ہیں،

محمد حسن عواد کا دیوان "البارکم" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے، ابو شادہ نے اسکو جدید رومانٹک شاعر قرار دیا ہے، ان کی نظم "متی" کے اشعار ملاحظہ ہوں،

متی نرتقی المجد الصریح المخلدا ۔۔۔ وتکتب فی التاریخ فخراً مؤبدا

متی نملک الشأن الرفیع جلالہ ۔۔۔ ونرمی الی العلیاء سهما مسددا

اما وجلال المجد ما المجد مدرک ۔۔۔ بغیر جهاد و یترک الشعب مسعدا

ہمیں غیر فانی عظمت کب ملے گی، اور کب تاریخ میں قابل فخر نقش ثبت کریں گے، جلالت وعظمت کی چوٹی پر کب پہنچیں گے اور کب بلندی پر عمدہ تیر پھینکیں گے، عظمت و سربلندی بغیر جد کے نہیں حاصل ہوتی اور حال یہ ہے کہ قوم کوشش سے غافل ہے،

صحرائے عرب کے سینے میں بھی اسی مسرت کا خواب مچل رہا ہے جو نام و نہاد مغربی تہذیب اقوام کو دے رہی ہے، عواد کا نیا دیوان "نحن کیان جدید" اس کی تمناؤں اور منصوبوں کا مظہر ہے،

سید الاموی مجلہ الحج کے اڈیٹر ہیں، انکی بعد کی تخلیقات "من تاریخنا" اور "الذکری" میں ملتی ہیں،

کویت کا چھوٹا سا علاقہ بھی اب عالمی سطح پر آگیا ہے، اس علاقہ کے شاعروں میں شوقی الایوبی احمد زین الصقاق مشہور ہیں، امیر ستر الغازی کے دیوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

قبلتھا وھی غضبی قبلۃ نطقت   لھا بما جن قلبی من تباریح

تشیب فی خدھا ماشب فی کبدی   ولاح من وجھھا ماعشی بھاردحی

وادبرت وکلانا فی جوانحہ   نار دمقلۃ غرقی لمسفوح

اس کی خفگی کے باوجود میں نے اس کا بوسہ لے ہی لیا تاکہ وہ درد وغم جو میرے قلب میں ہے اس سے بیان کردے، وہ شعلے جو میرے جگر میں بھڑکتے تھے اس کے چہرہ پر ہویدا ہوگئے، اس کے رخساروں نے وہ راز افشا کردیا جو میری روح میں پوشیدہ تھا، وہ لوٹ گئی اور ہم دونوں کے سینوں میں آتش سوزاں تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے.

یہ اشعار ابن شبل اندلسی کی ایک چھوٹی سی نظم "قبلۃ" کی یاد دلاتے ہیں، یہ نظم عربی شاعری کی عظمت دیرینہ اور اس کی تجدید کا آغاز ہے،

اس بے ترتیب اور مختصر جائزہ کو ختم کرنے سے پہلے "شیخ ابراہیم الدباغ" کا ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ فلسطین کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا، ان کی ایک کتاب "فی ظلال الحریۃ"

کے نام سے ۱۹۵۴ء کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب ان خطوط پر مشتمل ہے، جو مصنف نے اپنے چچا کو لکھے تھے اور جو تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات پر مشتمل ہے، اس کا دیباچہ "عادل الغذبان" کے قلم سے ہے، انھوں نے "دباغ" کو "شاعر الانسانیۃ" کے لقب سے یاد کیا ہے، دباغ انقلابی شاعر تھا، اور آزادی اس کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی، مگر اسے کیا خبر تھی کہ لیل و نہار کی گردشیں خود اسی کے گھر کی آزادی چھین لیں گی،

یاسائلی عن ھوی نفسی وبغیتھا   من الحیوۃ وقد غصت بتکدیر

ھوای تحریر اھل الارض من ملاء   من الھداۃ واقطاب لل سانیر

فکل نفس لھا من سعیھا امل   ولا تنال مناھا دون تحریر

اے میری روح کی خواہشات اور اسکی آرزو کے پوچھنے والو میری زندگی غم واندوہ سے بھری ہے، میری خواہش یہ ہے کہ کمین ہر فرد کی کوششوں کا مقصد ہوتا ہے، اور یہ مقصد بغیر آزادی کے نہیں حاصل ہوتا،

دباغ نے متعدد قصیدے لکھے ہیں، جنمیں فلسطین کی ہولناک قسمت کی منظر کشی کی ہے، فلسطین الطارحۃ، الوطنی الاول، اعلام الوادی، اعلام الشرق، دم الشہید وغیرہ مشہور قصیدے ہیں،

دباغ ازہری تھا، لیکن اس کی نشو ونما آزاد فضا میں ہوئی ہے، اس لیے حب الوطنی اور صوفیانہ جذبات دونوں اس کی شاعری میں ملتے ہیں، اس کے دوستوں نے اس کی تصانیف "حدیث الصومعہ" "تاریخ الحریۃ فی العالم" اور "نقد شعراء العالم" تلاش کرکے شائع کرائی ہیں.

بحیثیت مجموعی جدید عربی ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے، اور پوری جرأت سے دنیا کا ادبی مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ آگے قدم اٹھا رہا ہے،

وفیات

کاکا محمد اسمٰعیل مرحوم مدراسی

از جناب مولوی ثناء اللہ صاحب، جامعہ دار السلام عمرآباد

کاکا اسمٰعیل صاحب مرحوم قوم ملت کی ان شخصیتوں میں تھے جنھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا اور لاکھوں قوم و ملت کی راہ میں صرف کیا، ہندوستان کے بہت سے مذہبی و قومی ادارے ان کی فیاضی سے سیراب ہوئے تھے، ایسے محسن قوم کے حالات سے دوسرے ارباب ثروت سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

علاقہ مدراس ضلع نارتھ آرکاٹ کا تاریخی مقام گڑھ آمبور کاکا محمد اسمٰعیل صاحب کا وطن تھا، آپ کے والد کاکا حاجی محمد عمر صاحب ایک دیندار بزرگ، دولتمند تاجر، علماء کے عقیدت مند، فیاض اور غریب پرور تھے، دینی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، مدراس کی روشن کمپنی جو علم نوازی میں مشہور تھی اور اب بند ہوگئی آپ اسکے ایک رکن تھے، گڑھ آمبور سے متصل اپنے نام کی مناسبت سے عمرآباد نامی ایک گاؤں آباد کیا اور وہیں ایک اعلیٰ دینی درسگاہ مدرسۂ دار السلام کے نام سے ۲۴ء میں قائم کی، چند ہی سال بعد دسمبر ۲۷ء میں آپ کا انتقال ہوگیا، آپکے بعد آپکے فرزند اکبر کاکا محمد اسمٰعیل صاحب نے جملہ کاروبار کو نہایت خوبی سے سنبھالا، والد مرحوم کی جملہ خوبیوں کے علاوہ آپ میں اور بھی بہت سے کمالات تھے، علمی اور دینی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے، دولت کا بیشتر حصہ ملی و قومی کاموں میں خرچ کرتے تھے، صاحب دل

مخلص، موحد اور متبع سنت تھے، متعدد علمی ادارے بذات خود چلا رہے تھے، حسب ذیل ادارے آپ کی یادگار ہیں:

(۱) جامعہ دار السلام عمرآباد

یہ ایک اعلیٰ دینی درسگاہ ہے جس میں طلبا کی تعداد سو سے متجاوز ہے، اس میں رہائش، خوراک اور درسی کتابوں کا انتظام بغیر کسی فیس کے مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے، اساتذہ کی تعداد گیارہ بارہ تک رہتی ہے، درس نظامی میں حذف و ترمیم کرکے اس کا ایک جدید، معقول اور جامع نصاب تیار کیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس جامعہ کو جنوبی ہند کا ندوہ کہتے تھے۔

(۲) محمدیہ اسکول

اس میں ہر قوم و مذہب کے بچے انگریزی اور ملکی زبانوں کی تعلیم پاتے ہیں، طلبا کی تعداد تقریباً دو سو اور اساتذہ کی چھ سات ہے۔

(۳) مدرسۂ نسواں

اس میں صرف مسلمان بچیوں کو دینی اور قومی تعلیم دیجاتی ہے، دو تین استانیاں کام کرتی ہیں۔

(۴) عمر لائبریری

یہ ایک نہایت شاندار کتب خانہ ہے، جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ٹمل کی بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ ہے، جس میں بلا تفریق ہر خاص و عام استفادہ کرتا ہے، ان کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے علمی اور دینی اداروں کی بڑی فیاضی سے امداد فرماتے تھے۔ دار المصنفین کے لائف ممبر تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ سے آپ کو اور مولانا مرحوم کو آپ سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔

نہایت ہی عالی حوصلہ اور بلند ہمت تھے، تقریباً پندرہ سال سے آپ کا تجارتی کاروبار بالکل بند تھا، جو ان اداروں کو چلانے کا سب سے بڑا سہارا تھا، لیکن آپ کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی نے ان

اداروں کو بند ہونے نہ دیا اور کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے۔ آپ کی فیاضی سے ہر قوم و ملت کے آدمی مستفیض ہوتے تھے، نہایت خلیق، متواضع اور ملنسار تھے، یگانہ بیگانہ، دوست اور دشمن سب آپکے حسن اخلاق کے مداح تھے۔ بڑے دانشمند اور مدبر تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو بڑی آسانی سے سلجھا دیتے تھے۔ اطراف کی ہر چھوٹی بڑی مسلم و غیر مسلم آبادی میں آپ کی حیثیت حکم کی تھی، ہر فرقہ کے لوگ اپنے خاندانی اور قومی اختلافات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اور آپ کے دانشمندانہ اور عادلانہ فیصلوں پر بے چون و چرا مطمئن ہو جاتے، آپ کی قومی اور ملکی خدمات کے اعتراف میں سرکار انگریزی نے "خان بہادر" کے لقب سے نوازا،

انتقال سے تین سال پیشتر آپ نے جامعہ کو چلانے کے لیے چند قابل اعتماد، مخیر اور ہمدرد ملت افراد کی ایک کمیٹی بنا دی جو بڑے اخلاص اور توجہ سے جامعہ کی دیکھ بھال کر رہی ہے، اور اس کی ترقی کے لیے فیاضی سے دولت خرچ کر رہی ہے۔

چار پانچ سال کے عرصہ میں آپ پر دو تین مرتبہ فالج کا حملہ ہوا، اور بالآخر اسی مرض میں ۴ امئی ۵۹ء جمعہ کی رات، دس بجے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا،

آپ نے اپنے پیچھے اپنے چھوٹے بھائی کاکا محمد اسحٰق صاحب ٹرسٹی جامعہ اور تین لڑکوں (کاکا رشید احمد صاحب سکریٹری محمدیہ اسکول و مدرسۂ نسواں، کاکا حاجی محمد عمر صاحب جائنٹ سکریٹری جامعہ دارالسلام عمر آباد، کاکا حاجی مولوی سعید احمد عمری سکریٹری عمر لائبریری) اور پانچ لڑکیوں کو چھوڑا ہے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

مطبوعاتِ جدیدہ

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق - از جناب بشیر احمد ڈار، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۹۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

کوئی قدیم ملک اور قوم بھی اخلاقیات کے اعلیٰ تصورات سے خالی نہیں ہے اور قدیم زمانہ سے ان میں اخلاقیات کے نظریات پائے جاتے رہے ہیں، اسی کی بنیاد پر مغربی قوموں نے فلسفۂ اخلاق مرتب کیا ہے، چین، ایران، یونان، مصر اور ہندوستان سب اخلاق و حکمت کا مرکز رہ چکے ہیں، اور یہاں کے حکماء، مصلحین نے اخلاقیات کی تعلیم بھی دی ہے، اور اس کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے، مگر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی جس سے قدیم حکما کے فلسفۂ اخلاق کی تفصیل معلوم ہوتی، لائق مؤلف نے اس کتاب کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا ہے، یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے، ان میں حکیم کونفیوشس اور چینی، گوتم بدھ، بھگوت گیتا، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون، ارسطو، رواقی اور مصری فلسفۂ اخلاق پر بحث کی گئی ہے اور انکا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، کتاب اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہے کہ اس میں ان مفکرین کی اخلاقی تعلیمات پر تنقید کرکے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور انکے مقابلہ میں اسلام کے اعلیٰ تصور اخلاق کو پیش کرکے اس کا تفوق ثابت کیا گیا ہے، بیشتر تنقیدیں صحیح اور معتدل ہیں، یہ کتاب اس کا ثبوت ہے کہ جدید علوم و فنون کی طرح فلسفۂ اخلاق کو یورپ کی ایجاد سمجھنا غلط ہے، اس کا اصل سرچشمہ مشرق ہی ہے، مولف نے یورپ کی اس ناقدر شناسی کا بھی ذکر کیا ہے، کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے اور بڑی معلومات افزا ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود انداز بیان میں شگفتگی ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اردو میں ایک سنجیدہ اور مفید علمی کتاب کا اضافہ ہوا۔

الدّین یسر - از مولانا محمد جعفر شاہ ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۶۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۶ ؍ روپیہ پتہ ایضاً

اسلام ایک فطری اور جامع دین ہے، اس کے دائمی اصول و احکام میں تنگی اور تکلیف مالایطاق نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دین آسان ہے، مگر اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کو ہر شخص اپنے مزاج و مذاق کے مطابق بدل سکتا ہے، پیش نظر کتاب میں مؤلف نے دین کے آسان ہونے کی آڑ میں ان دینی احکام کی شکل و نوعیت میں بھی جو عہد نبویؐ سے ابتک مسلّم چلی آرہی ہے، رد و بدل کا مشورہ دیا ہے، مثلاً نماز، اس کی ماثورہ دعاؤں، نماز جنازہ، روزہ، سرقہ، زنا اور شرب خمر کی حدود و تعزیرات کی دوسری متبادل صورتیں بھی اختیار کی جاسکتی ہیں، اور زکوٰۃ کے نصاب کی تعیین، شیخ فانی اور مشقت کا کام کرنے والے مزدوروں اور کسانوں سے روزہ نیز غلامی اور تعدد ازدواج وغیرہ کو ختم کیا جاسکتا ہے، موجودہ حالت میں ضبط ولادت بہتر ہے، اگر مصروفیت کے باعث صرف فجر و عصر کی نمازیں پڑھ لیجائیں تو کافی ہیں، اور وضو میں اگر صفائی کے ساتھ اعضا دھولئے جائیں تو تین مرتبہ دھونے کی مسنون قید پر عمل ضروری نہیں ہے، نماز مادری زبان میں پڑھی جاسکتی ہے، کتابی مردوں کیا مشرکین سے بھی ذہنی ارتقاء کے زمانہ میں مومن عورتوں کے نکاح کی اجازت ہوسکتی ہے، جو پہلے صرف اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ مصنف کے نزدیک ارباب حل وعقد اسلام کے تمام قطعی احکام میں ترمیم کرکے اس کو آسان بنا سکتے ہیں، اس سے اس کتاب کی نوعیت اور ثقافت اسلامیہ کے ذہنی اور دینی کارناموں کا اندازہ ہوسکتا ہے، کتب فقہ کے متعلق مصنف کا یہ شکوہ بیجا ہے کہ اس میں طہارت، صلوٰۃ اور نکاح وغیرہ مسائل کے ساتھ تزکیۂ ایمان اور اخلاق کے ابواب کیوں نہیں ہیں اسلئے کہ فقہ تو ظاہر شریعت ہی سے بحث کرتی ہے، امت کے متفقہ تعامل کو صرف اس لیے رد کرنا کہ اس زمانہ میں ملوکیت، استبداد اور بہت سی بدعتوں پر بھی امت کا تعامل ہوگیا ہے، محض مغالطہ ہے، ان خامیوں کے ساتھ کتاب میں بعض مفید باتیں بھی ہیں، انداز بیان شگفتہ اور مدعا کو سمجھانے کے لیے بکثرت مثالیں پیش کی گئی ہیں، اس کتاب سے مصنف کی ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی ہے، مگر دینی نقطۂ نظر سے سخت گمراہ کن ہے۔

رکعاتِ تراویح - از مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ناظم صاحب جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

فاضل مؤلف کی شخصیت تعارف سے مستغنی ہے، اس رسالہ میں انھوں نے دلائل سے آٹھ رکعت تراویح کو غلط اور بیس کو صحیح ثابت کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال تک امت کا عمل بیس رکعت یا اس سے زائد پر رہا، فاضل مصنف کی نظر حدیث و فقہ پر بڑی گہری ہے اور انھوں نے زیر بحث مسئلہ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے، لیکن ان کے تمام دلائل سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور ان کے جیسے سنجیدہ اہل قلم سے جماعت اہل حدیث خصوصاً صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبد الرحمن مبارکپوری مرحوم پر طنز و تعریض نگاہ میں کھٹکتی ہے،

رحمت دو عالم - مؤلفہ علامہ قاری احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۰۵، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عکر ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبرا

سیرت نبویؐ پر اردو میں اتنا لکھا جاچکا ہے کہ ان کی مدد سے مستقل کتابیں تیار ہوسکتی ہیں، اس نئی کتاب میں بھی سیرت پاک کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، اور اس کے آخر میں اخلاق و عادات کے عنوان کے تحت حدیث کی معتبر کتابوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور معمولات اور بعض صحابہؓ کے مختصر حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں، زبان و بیان، کتابت وطباعت اور واقعات کی صحت میں اس سے زیادہ اہتمام کی ضرورت تھی، کتاب عام خواندہ مسلمانوں کے لائق ہے،

مینائے غزل۔ از جناب بشیر فاروق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گردپوش قیمت ؏ پتہ مکتبہ لالہ زار چیپ جون بلڈنگ، الفنسٹن اسٹریٹ، کراچی۔

یہ جناب بشیر فاروق (کوئٹہ) کا مجموعہ کلام ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور خوش مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے، شاعر کا غم "غم جاناں" کے بجائے "غم دوراں" ہے، "تلاش" و "تلاطم" میں ان کا اصل رنگ نمایاں ہے، باطنی محاسن کے ساتھ طرز ادا و بیان کی خوبیوں سے بھی کلام آراستہ ہے، شروع میں جناب جگر مرادآبادی، رئیس امروہوی اور خواجہ عبد الحمید عرفانی نے شاعر کا تعارف اور اس کے کلام کی خصوصیات بیان کی ہیں،

المطالعة العربية حصہ اول ودوم — مولفہ جناب ابوبکر شبلی صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۳، ۶۳، قیمت عہ عہ ناشر سندھ اکیڈمی، سکھر۔ مغربی پاکستان،

یہ عربی ریڈر عربی کے مبتدی طالب علموں کے لیے مرتب کی گئی ہے، اور اسباق کی مشقیں بھی دیدی گئی ہیں، وضاحت کے لیے تصویریں بھی ہیں، عربی زبان سیکھنے والوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دیوان داؤد اورنگ آبادی۔ مرتبہ خالدہ بیگم صاحبہ چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴، قیمت عہ نئے پیسے۔ پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن

دکن کے مشہور شاعر سراج کے ہم عصر ایک اور شاعر داؤد دکنی تھے، جنکا پایہ شاعری میں سراج سے کم نہ تھا، لیکن انکے کلام کو ویسی شہرت حاصل نہ ہو سکی، خالدہ بیگم صاحبہ نے انکا دیوان تین قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کرکے شائع کیا ہے جو داؤد کی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے، دو سو سال قدیم ہونے کے باوجود کلام میں روانی اور سلاست ہے اور اسکے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی، دیوان کے شروع میں داؤد کے مختصر حالات اور انکے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، اسکی اشاعت سے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا۔

"ض"

جلد ۸۴ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۹ء نمبر ۵

فہرست مضامین